انتظارِ سحر



ظہور الحسن بھوپالی

چھپتے چھپتے

"انتظارِ سحر" ۳ ماہ کی تاخیر کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ۵ر جولائی کو مارشل لار کے نفاذ کے بعد اس کی طباعت کا کام روک دیا گیا۔ اور جب مارشل لار حکام سے اس کی اشاعت کے سلسلے میں کسی قسم کی پابندی نہ ہونے کی وضاحت ملی تو انتخابی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اور یوں میں اس طرف توجہ نہ دے سکا۔ بہرطور اب فی الحال فرصت ہی فرصت ہے۔ اس لئے میری ساری توجہ "مکتبۂ قدسیہ" پر ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی مکتبہ کی دوسری کتاب بھی آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ یہ کام میرے اصل پیشہ یعنی صحافت سے نہ صرف قریب ہے بلکہ میرے مزاج کے مطابق ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جنوری سے اب تک کی بے روزگاری کا علاج بھی ہے۔

۵ر جولائی کو پاکستان کی مسلح افواج نے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں تو ملک کے عوام نے سکون کا سانس لیا اور تحریک کے دوران کے سارے گلے شکوے دور ہو گئے۔ اور اب پاکستان کے عوام نے اپنا مقدر موجودہ عبوری انتظامیہ سے وابستہ کر لیا ہے۔ جنرل ضیار نے قوم سے جو خطابات کئے ہیں ان کی روشنی میں فی الحال یہی امید رکھنا چاہیئے کہ ایک "مومن" فوج کے مومن سپاہی کی حیثیت سے وہ جلد از جلد جمہوری حکومت کی بحالی کے وعدے میں سچے ثابت ہوں گے اور وہ "سحر" ضرور طلوع ہوگی جس کی یہ قوم عرصہ دراز سے منتظر ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتظارِ سحر

ظہور الحسن بھوپالی

تصنیف ...... ظہور الحسن بھوپالی
ناشر ...... مکتبہ قدسیہ
طبع اوّل ...... دو ہزار ۲۰۰۰
کتبہ ...... ارتقائے ادب
مطبع ......

۲۵ جون ۷۷ء

قیمت :- دس روپے ۱۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ قدسیہ

۵۷-این بلاک ۲ - پی.ای.سی.ایچ سوسائٹی کراچی
فون ۴۳۷۹۹۲ - ۴۳۷۹۶۱

انتساب

شہیدانِ باصفا اور اسیرانِ باوفا کے نام

(جنہوں نے تحریک نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم
کی راہ میں قربانیاں دیں)

کچھ بیاں اپنا

میں نہ تو کوئی ادیب ہوں اور نہ کوئی مصنف اور نہ مجھے تصنیف و تالیف کا کوئی تجربہ ہے۔ صحافی ہوں مگر عملی صحافت سے باقاعدہ تعلق ۳۰ر جون ۷۳ء سے ختم ہو چکا ہے۔ اس تعلق کی تجدید کی کوششوں میں ضرور مصروف ہوں مگر کون جانے یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے ان دنوں صحافی ہونے کے لئے زبان داں ہونا ضروری نہیں بلکہ میرے مرحوم استاد مولانا حسن ریاض اکثر کہا کرتے تھے کہ اردو زبان کے معیار کی پستی کی ذمہ دار موجودہ صحافت ہے اور آج کل صحافی وہ بنتا ہے کہ جس کا اردو ادب سے تعلق تو بڑی بات ہے اردو صرف ونحو کا علم بھی بس یونہی سا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرا کوئی مضمون روزنامہ جنگ میں شائع ہوتا تو صبح ہی صبح کلاس میں پہونچنے کے بعد مولانا حسن ریاض صاحب مرحوم بے شمار سرخ نشانوں کے ساتھ وہ مضمون میرے حوالے کرتے ایک بار میرے ایک بزرگ صحافی اور مولانا کے ایک شاگرد کا ایک مضمون جنگ میں شائع ہوا جس میں جگہ جگہ دستور ساز اسمبلی کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی مولانا نے مضمون پڑھا تو بھڑک اٹھے کہنے لگے کہ یہ دستور ساز کیا چیز ہے۔ اسمبلی نہ ہوئی جوتوں کا کارخانہ ہو گیا۔ قانون بنایا نہیں وضع کیا جاتا ہے۔ اس لئے صحیح اصطلاح "مجلس واضعان قانون" ہے۔ ان کی دلیل نے مجھے اپیل کیا مگر اس کو کیا کیا جائے کہ جب بھی میں نے اپنے کسی مضمون میں یہ اصطلاح استعمال کی اخبار میں اشاعت سے قبل ایڈیٹر کا قلم اس پر چل گیا۔ مولانا حسن

ریاض صاحب پرانے زمانے کے کہنہ مشق صحافی تحریک پاکستان کے عظیم مجاہد اور ایک مشفق استاد تھے یہاں کا مجھ پر سب سے بڑا احسان ہے کہ انھوں نے میرا زبان دانی کا زعم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توڑ دیا۔ اور اب مستقل یہ احساس طاری رہتا ہے کہ میں ایک ایسا طالب علم ہوں کہ جس نے ابھی کچھ نہیں سیکھا۔

قارئین کرام! اسیری کی جو داستان خطوط کی صورت میں آپکے سامنے ہے اس میں اگر کوئی زبان و بیان کی غلطیاں تلاش کرنے بیٹھ گیا تو شاید اسے ہر صفحے پر سرخ لائنیں لگانا پڑیں گی۔ اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ کوئی ادبی شہ پارہ نہیں ہے بلکہ نظر بندی کے احساسات کا اظہار ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب میں نے ابتدائی خطوط لکھے تو میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ کسی باقاعدہ تصنیف کا آغاز ہے کیونکہ میرے ذہن میں ان خطوط کے لکھنے کا مقصد وقت گزاری، خود سے متعلق لوگوں کو اطمینان دلانا اور منتشر خیالات کو بغیر کسی ترتیب کے پیش کرنا تھا۔ جب میں ہسپتال منتقل ہوا تو معلوم ہوا کہ قبلہ والد محترم نے تمام خطوط کی نقول محفوظ کرلی ہیں۔ ہسپتال ہی میں یہ تجویز سامنے آئی کہ خطوط کے آئینے میں اسیری کی یہ داستان شائع کردی جائے۔ دوستوں نے حوصلہ افزائی کی، والد محترم مولانا تاج الدین چشتی صاحب نے ان خطوط کو باقاعدہ مرتب اور مدوّن کیا اور کتابت اور اشاعت کی منزلوں کی ذمہ داری کی نگرانی محترم شمیم الدین صاحب نے سنبھال لی اور یوں یہ کتاب آپ کے ہاتھوں تک پہونچ گئی۔

ان خطوط میں نظر بندی کے دنوں کی روداد بھی ہے اور مختلف سماجی سیاسی مسائل پر نکتہ چینی کا اظہار بھی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مختلف مسائل پر میرا تبصرہ یا تجویز کردہ حل حرف آخر نہیں ہے لیکن

میں پوری دیانت داری سے یہ سمجھتا ہوں کہ قوم کو فی الوقت جو نازک اور اہم مسائل درپیش ہیں اور ہر فرد کا ذہن جن امور پر سوچ وبچار میں مصروف رہتا ہے ان خطوط میں ان کا آپ کو عکس نظر آئے گا اور ساتھ ہی حالیہ تحریک کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں عوامی نکتۂ نظر کی جھلک بھی ملے گی۔ چونکہ یہ کتاب بغیر کسی طے شدہ پروگرام کے ترتیب پا گئی ہے اس لئے اس میں آپ کو فطری بے ساختگی کا عنصر غالب نظر آئے گا بعد کے خطوط میں شاید یہ بے ساختگی برقرار نہ رہ سکی ہو اس لئے کہ اس وقت تک اس کی اشاعت کا منصوبہ بن چکا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے کوشش یہی کی ہے کہ اپنے بے ربط خیالات کو سادہ اور عام فہم انداز میں پڑھنے والوں تک پہونچا دیا جائے میری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوتی ہے اس کا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں اس لئے فیصلہ تک پہنچیں اور مجھے اجازت دیں۔

خدا حافظ

ظہور الحسن بھوپالی

نقشِ اوّل

"جیل کا تجربہ میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے یہاں پہنچ کر آزادی سے محرومی کا کوئی احساس نہیں۔ اوّل تو میرے بزرگ میرے ساتھ ہیں اور دوسرے یہ کہ آپ کی تربیت نے میرے اندر اطمینان قلب اور اعتماد الٰہی کے سبب سکون کی جو خصوصیت پیدا کر دی ہے وہ ہمیشہ میرا زادِ راہ ثابت ہوتی رہی ہے۔"

۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء

پیارے بابا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ

آج ۲۶ تاریخ ہے صبح کے ۷ بجنے والے ہیں اور اس طرح ہمیں داخل زنداں ہوئے ۲۴ گھنٹے مکمل ہو گئے ہیں۔ ان ۲۴ گھنٹوں میں آپ سے بات چیت کا موقع نہ مل سکا۔ آپ سوچتے ہوں گے بھلا جیل میں فرصت کا کیا کال، مگر بات یہ ہے کہ یہاں ان دنوں رنگ محفل زوروں پر ہے۔ کراچی جیل مکمل طور پر بھر چکی ہے سنا ہے حیدرآباد کا بھی یہی حال ہے۔ زیادہ تر نظر بندوں کی منزل اب سکھر ہے جگہ کی تنگی کا وہاں بھی یہی حال ہے مگر اس منتقلی کا سبب یہ ہے کہ کراچی جیل میں گنجائش سے چار گنا قیدی آ چکے ہیں تو ابھی سکھر میں یہ حد صرف دوگنا ہے۔ ہمیں بھی کل ایک بجے سپرنٹنڈنٹ جیل نے یہ مژدہ سنایا کہ سکھر چلنا ہے۔ مولانا نورانی صاحب قبلہ کے مزاج کو تو آپ جانتے ہی ہیں انہوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ جناب مزاری ہیں جن کی کمر اور دائیں ٹانگ میں درد کی تکلیف ہے اور ظہور بھوپالی کا حال ہی میں آپریشن ہوا ہے یہ لوگ بذریعہ روڈ ۳۰۰ میل کا سفر نہیں کر سکتے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے دو گھنٹے بعد اطلاع دی کہ آپ حضرات کو بذریعہ طیارہ لے جانے کے لئے وزیر اعلیٰ سے اجازت مانگی گئی ہے۔ اس لئے فی الحال روانگی ملتوی۔

ایک اور لطیفہ یہ ہے کہ صبح ۵ بجے سے لے کر ۱ بجے کے دوران جیل کی

انتظامیہ کے ذریعے کچھ مزید انکشافات بھی ہوئے ہیں۔ ہمیں جو حکم دکھا کر لایا گیا تھا اس کے تحت ہم سے امن عامہ کے تباہ ہونے کا خطرہ لاحق تھا اس لئے ریاست ہمیں ایک ماہ کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر نظر بند کرنے کے لئے مجبور ہو گئی تھی مگر سکھر منتقلی کا حکم ملا تو یہ معلوم ہوا کہ ہم پر کچھ سنگین مقدمات بھی قائم ہیں جو زیر سماعت ہیں اور ہم دراصل زیر تفتیش قیدی (UNDER TRIAL PRISONER) ہیں

جیل کے اندرونی دروازے میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر سیاسی نظر بندوں کا بلاک ہے جس میں ہمیں رکھا گیا ہے۔ مگر یہ نہ سمجھیں کہ محض یہی ونگ سیاستدانوں کے لئے مخصوص ہے اور بھی بیرکس ہیں جن کی تفصیلات میں پھر کسی وقت عرض کروں گا۔

کل صبح جب ہم اپنی اس بیرک کے احاطے میں داخل ہوئے تو صحن میں کمروں کی گیلریوں میں ہر جگہ لوگ سوئے ہوئے نظر آئے ہمارے داخل ہوتے ہی ہر طرف سے لوگ آنکھیں ملتے ہوئے ہمارے گرد جمع ہونے لگے۔ معلوم ہوا کہ کل رات ہی ۱۰۵ افراد مختلف تھانوں سے لائے گئے ہیں اور جگہ نہ ہونے کے سبب انھیں محض ونگ کے احاطے میں چھوڑ دیا گیا۔ ان میں سے کئی ایک کے جسموں پر زدوکوب کے واضح نشانات ہیں۔ یہانتک کہ بعض کی پیٹھ پر کھال اُدھڑی ہوئی صاف نظر آرہی ہے۔ ان میں بچے بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ ایک صاحب ایسے تھے جن کے ہاتھ میں ناشتہ دان تھا وہ ڈیوٹی سے گھر واپس جا رہے تھے کہ دھر لئے گئے۔ ایک صاحب کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنی دوکان کے لئے سودا خریدنے حیدرآباد سے کراچی پہنچتے ہی بولٹن مارکیٹ پر اترے ہی تھے کہ پولیس والوں کو پسند آگئے۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ آنکھیں ملتے

ہوئے یوسف بلوچ بھی خیر مقدم کے لئے تشریف لے آئے انہوں نے سب سے بڑی گرمجوشی کے معانقہ کے بعد موجود سارے لوگوں سے ...... سر پر بل چلے گا کے پر جوش نعرے لگا کر مولانا نورانی صاحب قبلہ کی قیادت میں ہمارا جو مختصر سا قافلہ داخل ہوا تھا اس کا استقبال کیا۔

ہماری بیرک میں ایک بڑا کمرہ ہے اس کے برابر ایک اور کمرہ ہے یہ ہمارے بیچ کے کمرے سے تھوڑا چھوٹا اور آپ کے کمرے سے بڑا ہوگا اس کے برابر دو چھوٹی چھوٹی کمریاں یا کھولیاں ہیں جن میں صرف ایک ہی پلنگ آسکتا ہے البتہ احاطہ بہت بڑا ہے۔ احاطہ کے دروازہ کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا کمرہ نما ہے جو شاید کبھی باورچی خانہ ہوگا اسی طرح احاطہ کے شمالی کونے میں پتھر کی بنی ہوئی ایک اجڑی سی عمارت ہے جسے اگر زیادہ اعزاز بخشنا چاہیں تو بارہ دری کہہ لیں اگرچہ اس کے بارہ دروازے نہیں ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ کسی زمانے میں خواتین جیل تھی مگر بعد میں اسے سیاسی ونگ بنا دیا گیا۔ ہماری بیرک کے بڑے کمرے میں جیئے سندھ تحریک کے چیدہ چیدہ رہنما ہیں۔ جن کا تفصیلی تعارف میں اگلی نشست میں کرا سکوں گا۔ ابھی تو صرف اتنا بتاتا چلوں کہ نظریاتی اور سیاسی اختلافات کے باوجود ان لوگوں نے بہت ہی پر جوش انداز میں ہمارا استقبال کیا اور ابھی ہم ٹھیک طور سے کرسیوں پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ان حضرات کی طرف سے چائے اور ناشتہ پیش کر دیا گیا۔ دوسرے کمرے میں ہم براجمان ہیں یعنی میرے ساتھ ہی دوست محمد فیضی اور یوسف بلوچ کے بھی پلنگ ہیں۔ جب ہم آئے تھے تو اس کمرے کی حالت بہت خراب تھی مگر اسے امکانی حد تک صاف ستھرا کرایا گیا۔ چاروں طرف کی دیواروں سے پلاسٹر ادھڑ رہا ہے مگر کمرہ ہوادار اور روشن ہے۔ برابر کی کمریوں یا کھولیوں میں سے ایک

میں حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صاحب قبلہ ہیں اور دوسری میں شاہ صاحب یعنی پروفیسر شاہ فرید الحق صاحب ہیں۔

ابھی ہمیں آئے ہوئے ۱۵ منٹ ہی ہوئے ہوں گے اور ہم درخت کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے خود کو ماحول سے آشنا کرنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ ان ۱۰۵ افراد کا بلاوا آگیا جو رات کو لائے گئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ چونکہ گنجائش بالکل نہیں ہے اس لئے جیل کے احاطے میں دو مجسٹریٹ بٹھا دیئے گئے ہیں جو پچاس روپے سے ۵۰۰ روپے تک جرمانے کر کے لوگوں کو چھوڑ رہے ہیں ان ہی عدالتوں میں ان ۱۰۵ افراد کو پیش ہونا ہے یہ حضرات واپس نہیں لائے گئے ان میں سے بیشتر جرمانے ادا کر کے آزادی پا گئے اور جو جرمانے ادا نہ کر سکے ان میں سے کچھ کو مختصر سزائیں دے کر جیل میں جہاں گنجائش نکل سکی وہاں چھوڑ دیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اطلاع ملی کہ سردار شیر باز خان صاحب مزاری تشریف لے آئے ہیں اور سپرنٹنڈنٹ جیل کے کمرے میں بٹھائے گئے ہیں۔ ان کو بعد میں ایک دوسری سیاسی بیرک اسپیشل ونگ میں رکھا گیا ہے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا اصرار تھا کہ ہم بھی وہیں منتقل ہو جائیں۔ شاہ صاحب اور فیضی اس بیرک کو دیکھنے بھی گئے مگر اس کا محض نام ہی اسپیشل ہے یہ ضرور ہے کہ باتھ روم میں ایک ٹوٹا پھوٹا فلیش لگا ہوا ہے جبکہ باقی پوری جیل میں ابھی پرانا نظام ہی چل رہا ہے ہم نے منتقلی مناسب نہ سمجھی ویسے مزاری صاحب کا بھی تقریباً پورا ہی دن یہاں گزرا دوپہر اور شام کا کھانا بھی انہوں نے ہمارے ساتھ ہی کھایا صرف رات کو وہ وہاں چلے گئے۔

۲۴ گھنٹوں کی تفصیلات خاصی طویل ہیں ابھی تو شاید یہاں پر کافی دن رہنا پڑے اس لئے بہت سے موضوعات پھر کسی وقت کے

لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ آپ سے باتیں کرتے کرتے ایک گھنٹہ ہو گیا۔ دوست محمد فیضی فجر کی نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئے ہیں۔ مولانا نورانی صاحب قبلہ اور شاہ صاحب بھی آرام فرما رہے ہیں۔

بابا! جیل کا تجربہ میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے یہاں پہونچ کر آزادی سے محرومی کا کوئی احساس نہیں اوّل تو میرے بزرگ میرے ساتھ ہیں اور دوسرے یہ کہ آپ کی تربیت نے میرے اندر اطمینان قلب اور اعتماد الٰہی کے سبب سکون کی جو خصوصیت پیدا کر دی ہے وہ ہمیشہ میرا زادِ راہ ثابت ہوتی رہی ہے اور میں پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ خدا کا یہ میری ذات پر کتنا بڑا کرم اور فضل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام۔ امام ابو حنیفہؒ، امام احمد حنبلؒ، مجدد الف ثانی اور فضل حق خیر آبادیؒ جیسے بزرگوں کی سنت پر عمل کا موقع ملا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ آپ کی سرپرستی میں جس تحریک سے میں وابستہ ہوا ہوں اس کے لئے موجودہ قربانیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ایک باپ سے زیادہ بیٹے سے کون واقف ہو سکتا ہے اور پھر ایسا باپ جس نے کہ اپنے بیٹے کے کردار کی تعمیر اور تشکیل میں قدم بہ قدم حصہ لیا ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم اقتدار کے لئے نہیں لڑ رہے۔ موجودہ حکمرانوں سے ہمارا کوئی جائیداد کا جھگڑا نہیں ہے۔ نہ ہی ان سے کوئی ذاتی دشمنی یا خاندانی دشمنی ہے۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہم نے اُس قافلہ سے اپنے آپ کو وابستہ کیا ہے جو نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کے راستے کا راہی ہے۔ ہم نے ظلم کو ظلم کہا ہے۔ ہم نے جس قدر بھی ممکن ہوا پوری جرأت کے ساتھ آمریت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کیا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اپنے آقا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا گنہگار امتی سہی مگر آپ جانتے ہیں کہ میں

نے ایک بار نہیں بارہا اقتدار کی پیش کشوں کو ٹھکرایا ہے اس میں میرا کوئی کمال نہیں بات صرف یہ ہے کہ یہ خدا کا فضل، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتیں، آپ کی تربیت، مولانا نورانی کی صحبت اور نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے کی برکتوں کا صدقہ ہے کہ ذاتی اقتدار اور کرسی کی خواہش کبھی کی دم توڑ چکی ہے۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ مدینہ طیبہ کی حاضری نے پوری کر دی ہے اور میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھ گنہگار میں بہت سی خرابیاں ہیں، بہت سی برائیاں ہیں مگر دنیاوی اقتدار اور مال ومتاع کا کوئی لالچ نہیں۔ ساری حرص وطمع دل سے نکل چکی ہے۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری موجودہ نظر بندی کاش دربار رسالت میں قبولیت حاصل کرلے تو شاید میری مکمل اصلاح ہو جائے اور پوری قوم کی یہ قربانیاں نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کے راستے کا سنگ میل بن جائیں تو یہ قبولیت ہماری منزل کو قریب تر کر دے گی جب ظلم، ناانصافی، استحصال کا خاتمہ ہوگا اور ایسی صبح طلوع ہو گی جس کے جلو میں اسلام کی رحمتیں اور برکتیں ہوں گی۔ یہ زمین اپنے خزانے اگل دے گی۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے گا پھر کسی کا استحصال نہیں ہوگا۔ یہ شاہراہیں اسلام دشمنی کے مراکز کے بجائے اللہ اکبر کی صداؤں سے گونجیں گی اور ہماری قیادت بڑے فخر سے کہہ سکے گی کہ سوشلزم، کمیونزم کیپٹلزم یا کوئی اور دنیاوی نظام انسانیت کے دکھ درد کا مداوا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ دیکھو اسلام نے تمہیں دنیاوی ترقی وعروج سے نوازا اور اب عاقبت کی دولت سے بھی مالا مال کر دے گا۔ یہ نظام تمہاری مادی ضروریات بھی پوری کر رہا ہے اور تمہاری روح کی تسکین کا سبب بھی ہے۔ پھر وہ بھی ہم میں آملیں گے جنہیں حالات نے گمراہ کر رکھا ہے۔ جنہوں نے اس ملک میں مسلسل اس بات کا نظارہ کیا ہے کہ جو

بھی اگر عوام کا استحصال کرتا ہے۔ وسائل دولت آفرینی پر چند لوگوں کے قبضہ کو پکا کرنا چاہتا ہے۔ غربت و امارت کی واضح تفریق کی پرورش کرتا ہے۔ وہ اسلام کا خادم ہونے کا مدعی بن کر آتا ہے۔ اس قسم کے خادمین اسلام ہی دراصل مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ انھیں تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ایسے لوگ جو اسلام کے نام کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کریں منافق ہی ہو سکتے ہیں۔

میں بھی کہاں سے کہاں نکل گیا آپ سے وہ باتیں شروع کر دیں جو آپ ہی سے سیکھی ہیں۔ امی شاید میری گرفتاری پر پریشان ہوں۔ ان سے کہہ دیں کہ میں محاذ پر ہوں اللہ نے چاہا تو غازی بن کر آؤنگا امی سے یہ بھی کہدیں کہ بیڈ ٹی یہاں بھی مل گئی ہے۔ ۹ بجے ناشتے کا پروگرام ہے سوچتا ہوں کہ جب تک میں بھی ایک نیند لے لوں۔

سب کو حفظ مراتب کے ساتھ سلام، دعائیں اور پیار۔

خادم

آپ کا بیٹا

ظہور الحسن بھوپالی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

(اہلیہ کے نام خط سے اقتباس)

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے بہت قریب رہ کر مولانا نورانی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے، میں نے اُنہیں شفقت محبّت احترام، عزّت اور دوسروں کے لئے ایثار کرنے میں ہمیشہ پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھا، ساتھ ہی وہ اِس معاملہ میں جتنے نرم و شفیق ہیں باطل کے سلسلے میں اتنے ہی سخت ہیں، اسی لئے جہاں لوگ اُن کے خلق کے قائل ہیں وہاں لوگ ان کی سختی سے بھی خائف رہتے ہیں۔"

۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء
۲ بجے دن

سعدی ڈیر۔ اسیر زندان کا سلام قبول کرو !

تم سوچ رہی ہو گی کہ میں نے خاصی تاخیر سے تمہیں یاد کیا۔ بات یہ نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی مصروفیات نے پیچھا نہ چھوڑا اب فرصت کے کچھ لمحات نصیب ہوئے تو سوچا کہ تم ہی سے گفتگو کر لی جائے۔

ابھی دو گھنٹے قبل قبلہ نورانی صاحب، شاہ فرید الحق صاحب، سردار مزاری صاحب اور دوست محمد فیضی سکھر روانہ کر دیئے گئے ہیں تمہاری کششں یا ڈاکٹر سلیمان صاحب کی سختی نے مجھے کراچی ہیں روک دیا ہے۔ ورنہ میری دلی خواہش یہی تھی کہ اپنے سیاسی ہمسفروں کے ساتھ ہی اپنا سفر جاری رکھوں۔ خصوصاً مولانا نورانی صاحب قبلہ کی قربت بہت بڑی سعادت ہے مگر وہ ڈاکٹر کی رائے پر سختی سے عمل کرانے کے معاملے میں خود بھی بہت سخت ہو گئے۔ انھوں نے بھی مجھے یہیں قیام کرنے اور ڈاکٹر سلیمان صاحب کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرنے کا حکم صادر کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختصر عمر میں طویل تجربات کے باوجود مولانا نورانی صاحب قبلہ کی شخصیت کا کوئی ہم پلہ فرد مجھے تو نظر نہیں آیا۔ جرأتمندانہ طرز فکر۔ بغیر کسی خوف کے ہر بات ڈٹ کر حوصلے کے ساتھ بیان کر دینے کا انداز تو میں نے کئی اور لوگوں میں بھی پایا ہے مگر ان کا اطمینان اور پرسکون ٹھہراؤ شدید سے شدید بحرانی حالات میں

بھی اسی طرح قائم رہتا ہے کہ ان کی مستقل مزاجی بس قابلِ دید ہی ہوتی ہے۔ میں نے بڑے سے بڑے المیہ پر بھی کبھی انھیں مایوس نہیں دیکھا۔ مسائل میں الجھے رہنے کے باوجود ان کے چہرے پر تفکر کے بل یا الجھنوں کی سلوٹوں کے بجائے ایک شان بے نیازی نظر آئے گی۔ یہاں تک کہ کسی شدید انفرادی یا اجتماعی مسئلہ میں ذہنی طور پر بہت زیادہ الجھے ہوں تو بھی کیا مجال ہے کہ کوئی قریب سے قریب شخصیت بھی ان کی الجھن یا پریشانی کو بھانپ سکے اللہ تعالیٰ پر توکل کا یہ عالم ہے کہ انھیں ہر دم یہ یقین رہتا ہے کہ ان کا ہر ذاتی مسئلہ بغیر کسی دوست ساتھی یا رشتہ دار سے ذکر کئے ہوئے خود بخود اللہ تبارک تعالیٰ حل فرما دے گا اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسے کئی واقعات کا عینی شاہد میں خود بھی ہوں۔ میرا تو جیل میں آنے کے بعد سے انہوں نے اس قدر خیال رکھا کہ شاید گھر پر گھر والے بھی اتنا نہ رکھ سکتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ شاہ فریدالحق صاحب، دوست محمد فیضی اور دیگر لوگ بھی ان کی توجہ کا اتنا ہی مرکز رہے۔ یہاں پہونچتے ہی سارے انتظامات انہوں نے اپنی نگرانی میں کرائے۔ کمروں کی صفائی سے لے کر بستروں کے بچھنے اور سامان کے جمانے کا سارا کام اپنے سامنے برداشتیوں یعنی جیل کے خدمتگاروں سے کرایا۔ اور ہم سب درخت کے نیچے بیٹھے ٹھنڈی ہوا کے مزے لیتے رہے اگر ہم میں سے کسی نے پیش قدمی کرنا بھی چاہی تو انہوں نے خود ہی اس طرح روک دیا کہ پھر کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے بہت قریب رہ کر ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے انھیں شفقت، محبت، احترام، عزت اور دوسروں کے لئے ایثار کرنے میں ہمیشہ پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھا ساتھ

ہی اس معاملہ میں انہیں جتنا نرم اور شفیق پایا۔ اتنا ہی سخت، میں نے ان کو باطل کے سلسلے میں بھی دیکھا ہے جس سے اصولوں میں اختلاف ہو وہ اس کی رو رعایت یا غیر ضروری لحاظ و مروت کرنے کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ اس لئے جہاں لوگ ان کے خلق کے قائل ہیں وہاں لوگ انکی سختی سے بھی خائف رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کسی کا مشورہ قبول نہیں کرتے یا لوگ ان کو مشورہ دیتے ہوئے ڈرتے ہیں بلکہ ان کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر مسئلہ پر اپنے سے چھوٹے یا جونیئر سے جونیئر آدمی سے مشورہ لیتے اور معقول مشوروں کو قبول کر کے اس پر عمل کرتے ہوئے میں نے انھیں کبھی جھجکتے ہوئے نہیں دیکھا یہ ضرور ہے کہ دنیاوی مصلحتوں کو وہ کسی قیمت پر صحیح موقف کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتے۔
میں کہاں سے کہاں نکل گیا حقیقت یہ ہے کہ مولانا نورانی صاحب قبلہ کے ساتھ مجھے جو قیمتی تجربات ہوئے ہیں اور انہوں نے مجھ پر جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں اگر ان کا ذکر چھڑ جائے تو پھر بے ساختہ قلم چلنے لگتا ہے اور مجبوریاں حائل نہ ہوں تو شاید ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔
مختصر یہ کہ مولانا نورانی صاحب قبلہ موجودہ دور میں مرد مومن کی صفات کا مظہر ہیں اور علامہ اقبال کے اس شعر کی مکمل تفسیر ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اب تم اپنی سناؤ! مجھے یقین ہے کہ تم کو جو پریشانی میری گرفتاری سے لاحق ہوئی ہوگی اس پر تم اب تک بڑی حد تک قابو پا چکی ہوگی۔ تم حمانی جان کے یہاں تھیں اس لئے یہاں آتے ہوئے تم سے ملاقات بھی نہ ہو سکی۔
تمہیں ویسے بھی میرے لئے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جو کچھ ہوا میں اس پر پوری طرح مطمئن ہوں ہم لوگ موجودہ

تحریک کو جہاد سمجھ کر سرگرم ہیں اس لئے ہمارے نزدیک اس ملک کو شخصی آمریت، زناکاری، شراب نوشی، جوئے اور عیاشی سے پاک کر کے نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کی جدوجہد ایک مقدس تحریک ہے میں بالکل نہیں سمجھتا کہ حکومت نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے اس لئے کہ اپنی علالت اور کمزوری کے باوجود حکمران پارٹی کے خلاف جدوجہد میں جو کچھ مجھ سے ممکن ہو سکا میں نے کیا ہے۔ میرا حوصلہ آج بھی اتنا ہی بلند ہے جتنا یہاں آنے سے قبل تھا۔ البتہ میرا ایمان ہے کہ ہمارے مدمقابل زیادہ دیر میدان میں نہ ٹھہر سکیں گے ان کو اپنی قوت، پولیس، ایف۔ ایس۔ ایف، انتظامیہ، سرمایہ اور بقول ان کے کرسی کی طاقت پر گھمنڈ ہے اور ہم محض اللہ کی نصرت پر تکیہ کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے مقصد کی لگن نے جرأت وہمت کی روح پھونک دی ہے اور اس طرح ہم کمزور ہوتے ہوئے بھی طاقت ور بن گئے ہیں جب کہ وہ طاقتور ہوتے ہوئے اتنے کمزور ہیں کہ مکمل طور پر دفعہ ۱۴۴ اور ہنگامی حالت کے نفاذ، کرفیو اور ملک کے ایک درجن شہروں کو مکمل طور پر فوج کے کنٹرول میں دینے اور سینکڑوں جانوں کی قربانی لینے کے باوجود انھیں ہزاروں افراد کو پابند زندان کرنا پڑا ہے مگر پھر بھی وہ حزب اختلاف کے کسی ایک آدمی کو بھی جھکانے پر آمادہ نہیں کر سکے ہیں اور نہ ہی لوگوں کے عزم وحوصلے کو کچلنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

کل کا دن جیل کے احاطے میں گھومتے پھرتے گزرا۔ ناشتہ کے بعد ہم لوگ سردار شیر باز صاحب مزاری کے کمرے میں جا بیٹھے۔ ان کی بیرک ہماری بیرک سے کوئی نصف فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ ابھی محفل رنگ پر بھی نہ آئی تھی کہ میر رسول بخش صاحب تالپور اپنے ۵ عدد سوٹ کیسوں کے ساتھ تشریف لے آئے انہیں سردار مزاری صاحب کے برابر کا کمرہ

دیا گیا ہے۔ میر صاحب کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ کیونکہ انہیں جیل آنے جانے کا کافی پرانا اور وسیع تجربہ ہے اس لئے وہ جب بھی جیل بھیجے جاتے ہیں تو کیل کانٹے سے لیس ہو کر جیل پہونچتے ہیں۔ ضرورت کی ہر شے ان کے سوٹ کیسوں میں ہوتی ہے۔ سوئی دھاگے سے لے کر تاش کی گڈی تک، کھانے پینے کے سامان اور کپڑوں سے لے کر کتابوں تک ہر چیز ان کے پاس موجود ہوتی ہے۔ وہ جیسے ہی مزاری صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے نورانی صاحب قبلہ نے ان سے پہلا سوال یہی پوچھا۔ سائیں کتنے سوٹ کیس لائے ہو؟ جواب ملا "پانچ" مولانا نے فرمایا چلیے اب کسی کو کسی چیز کی تکلیف نہیں ہوگی اس لئے کہ میر صاحب اپنے ساتھ دوسروں کا بھی تفصیل سے خیال رکھتے ہیں۔ مولانا نے ہمیں بعد میں بتلایا کہ میر رسول بخش صاحب جتنا تفصیلی سامان لے کر چلتے ہیں ان کے بڑے بھائی علی احمد صاحب تالپور اتنا ہی مختصر سامان لے کر چلنے کے عادی ہیں۔ میر صاحب پہونچے تو اتنے میں چودھری ظہور الہیٰ صاحب بھی ٹہلتے ہوئے آنکلے جو کراچی جیل میں ناکردہ جرائم کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ میر رسول بخش صاحب نے بتایا کہ وہ رات کو گرفتار کر کے ہالہ ریسٹ ہاؤس میں لے جائے گئے تھے جہاں نواب مظفر پہلے ہی سے موجود تھے۔ نواب صاحب کو سکھر جیل روانہ کر دیا گیا اور میر صاحب کو صبح کا ناشتہ کرا کر کراچی جیل روانہ کیا گیا۔ میر صاحب کوئی گیارہ بجے پہونچے تھے اور انہوں نے آنے کے بعد ہمیں ہڑتال کے بارے میں سب سے پہلی اطلاع دی اور بتایا کہ سڑکیں مکمل طور پر سنسان ہیں اور ہڑتال زبردست ہے۔ انہوں نے بتایا کہ سپر ہائی وے کے سو میل کے سفر میں انھیں صرف ۴ کاریں حیدرآباد جاتی ہوئی نظر آئیں جبکہ عام طور پر اوسطاً ہر منٹ پر ایک گاڑی مخالف سمت سے

گزرتی ہے۔

مزاری صاحب کے یہاں سے چودھری ظہور الٰہی صاحب کے کمرے میں جانے کی صلاح ہوئی اور یہ قافلہ اسپیشل وارڈ سے ۱۹ نمبر بیرک کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں چودھری صاحب اے کلاس کے قیدی ہیں کہنے کو تو نورانی صاحب قبلہ، شاہ صاحب، مزاری صاحب اور میر صاحب کو بھی اے کلاس دی گئی ہے۔ لیکن وہ اے کلاس برائے نام ہے۔۔۔ سپرنٹنڈنٹ کا کہنا یہ تھا کہ پورے جیل میں اے کلاس کا صرف ایک ہی کمرہ ہے اور اس میں چودھری ظہور الٰہی ہیں۔ اس کے علاوہ اے کلاس کی سہولت کی رہائش کراچی جیل میں نہیں ہے۔

چودھری صاحب ہی کی قیادت میں یہ قافلہ ان کی بیرک میں پہنچا انکی بیرک ہماری بیرک سے کافی فاصلے پر ہے۔ وہاں پہونچے تو تھوڑی ہی دیر میں مولانا شاہ احمد نورانی صاحب قبلہ، سردار شیر باز مزاری، شاہ فرید الحق، دوست محمد فیضی، یوسف بلوچ اور اس خاکسار کے علاوہ سابق مدیر جسارت جناب محمد صلاح الدین، جناب زین نورانی جناب ہارون احمد اور متعدد دیگر نمایاں افراد شریک محفل ہوگئے۔ شرکاء محفل کی چائے، بسکٹ اور تلی ہوئی دال سے تواضع کی گئی۔ خوب جی بھر کر قہقہے لگے۔ دل کی بھڑاس بھی نکالی گئی، خبروں پر تبصرہ بھی ہوا، لطائف بھی سنائے گئے۔ مگر پوری گفتگو کا محور سیاسی ہی رہا اور یوں ہم نے اپنے تیئں دفعہ ۱۴۴ کی خوب خوب خلاف ورزی کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ محفل جیل کے حکام پر بڑی گراں گزری صبح ہی صبح سپرنٹنڈنٹ جیل یہ درخواست لے کر آٹے کہ یہ محفلیں ان کی ترقی معکوس کا سبب بن سکتی ہیں اس لئے ان سے گریز کیا جائے اور دن کے وقت جب تک عام قیدیوں کی بیرکیں کھلی ہوں جلوس کی شکل میں ایک جگہ سے دوسری

جگہ جانے سے پرہیز کیا جائے۔ ان کا لہجہ تحکمانہ نہیں بلکہ فدویانہ تھا اس لئے ہم نے بھی ان کو تسلی دی اور کہا کہ ہمیں بھی بھری دوپہر میں اِدھر اُدھر گھومنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ کمرے میں پنکھے کے نیچے لیٹنے سے زیادہ پیار ہے۔ کل تو سکھر کے مسافروں کو رخصت کرنا تھا اس لئے ہم نے اتنی محنت کر لی۔

ویسے بھی جیل کی انتظامیہ کی پریشانی حق بجانب تھی کل ہم لوگ جو نکلے تو مختلف بیرکوں میں لوگوں نے ہمیں دیکھ دیکھ کر ..... کے سر پر ہل چلے گا کے پرجوش نعرے لگائے اور بیرکوں کے احاطہ کی سلاخوں سے ہاتھ نکال نکال کر قبلہ نورانی صاحب، مزاری صاحب اور دیگر ہم سب ہی لوگوں سے خوب خوب ہاتھ ملائے۔ قومی اتحاد کے کارکنوں کی اتنی کثیر تعداد یہاں موجود ہے کہ بڑی آسانی سے جلسے، جلوس کی خواہش کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ جدھر سے بھی نکلے "۷" کا نشان اپنا منتظر پایا۔

آج چودھری ظہور الٰہی اور صلاح الدین صاحبان یہیں تشریف لے آئے تھے اور میں بھی فی الوقت اپنے کمرے میں ہی بیٹھا ہوں۔ سامنے صحن میں کبوتر کا ایک جوڑا درخت کے سائے میں زمین کرید کرید کر ایک دوسرے کی خاطر مدارات کر رہا ہے اور میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ برابر کے کمرے سے سندھ عوامی تحریک کے اسماعیل سوہو صاحب آ کر بیٹھے ہیں یوسف بلوچ کے خراٹے پورے کمرے میں گونج رہے ہیں۔ اس لئے سوہو صاحب کو مزید انتظار میں بٹھانا ممکن نہیں۔ یوں اب تم سے اجازت چاہتا ہوں اور سوہو صاحب سے گفتگو کا آغاز کرتا ہوں۔ مگر دیکھو صبا اور ننھی صدف کو پیار کرنا نہ بھولنا۔ بابا۔ امی۔ اپی، ممانی جان، ماموں جان اور دیگر خاندان کے سارے بڑوں کو سلام

تمہارا۔ ظہور بھوپالی

ماں کے نام بیٹے کا خط

"ممتا کے جذبہ اور شفقتوں کا ادراک کوئی ماں ہی کر سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں میں تسکین کا تجربہ مجھے بھی ہے، ممتا کے اس جذبے کو نہ تو الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہے اور نہ ہی اسے کوئی تصوّراتی خاکہ دیا جا سکتا ہے، میں تو یہ کہوں گا ماں بذات خود ایک ایسا لفظ ہے جس میں مٹھاس ہی مٹھاس ہے۔"

۲۹ مارچ ۱۹۷۷ء
۱۰ بجے دن

پیاری امی۔ بہت سے سلام

کل دن بھر سوچتا رہا کہ آپ کو خط لکھوں مگر تنہائی کے لمحات میسر نہ آئے۔ صبح ناشتہ کے بعد نیند آگئی اور دوپہر کو کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ جماعت اسلامی کے سید منور حسن صاحب کی آمد آمد کا شور مچ گیا یہاں ان دنوں کوئی گرفتار آتا ہے تو اس کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے بلکہ ہمارے دوست یوسف بلوچ کی نظریں تو دروازہ پر ہی لگی رہتی ہیں اور وہ مسلسل اب کوئی آیا اب کوئی آیا کی گردان کرتے رہتے ہیں۔

منور صاحب نے میری گرفتاری کے روز صبح کے وقت آپ سے جو گفتگو کی تھی اس کی تفصیل بتائی کہ آپ نے انہیں میری گرفتاری کی اطلاع دیتے ہوئے یہ کہا کہ "یہ سمجھتے ہیں کہ رہنماؤں کی گرفتاری سے تحریک دب جائیگی۔ اب ہم بوڑھی عورتیں بھی باہر نکل آئیں گی" آپ کی اس گفتگو سے مجھے تقویت ہو گی کہ آپ کا حوصلہ بلند ہے۔ اور کیوں نہ ہو موجودہ آزمائش دراصل ایک قومی آزمائش ہے۔ نہ جانے کتنی ماؤں کے لخت جگر جیل میں ہیں۔ ابھی کل برابر کی بیرک میں قومی اتحاد کے گرفتار شدہ کارکنوں سے ملاقات ہوئی تو ان میں تین بھائی ایک ساتھ گرفتار ملے۔ حسینی چوک حیدرآباد پر جو گولی چلی ہے اس میں دو سگے بھائیوں نے جن کی عمریں ۱۰ سال اور ۱۲ سال تھیں ایک ساتھ دم

توڑا ہے، ایسے حالات میں آپ کے بیٹے کے ساتھ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے وہ صرف آپ کے بیٹے کے ساتھ نہیں پوری قوم کے ساتھ ہو رہا ہے بلکہ قوم کی بے شمار ماؤں اور ان کے بیٹوں نے مجھ سے اور آپ سے زیادہ قربانیاں دی ہیں۔

میری بیماری پر آپ کو تشویش یقیناً بجا ہے مگر اس وقت مجھ سے زیادہ تکالیف اور مصائب میں ہزاروں پاکستانی بیٹے یعنی اپنی ماؤں کے لاڈلے مبتلا ہیں۔ اس لئے آپ کو میرے لئے فکرمند نہ ہونا چاہیئے بلکہ پوری قوم یا اپنی ضعیفی کے پیش نظر میرے حلقہ انتخاب میں کم از کم آپ گھر گھر جا کر علاقہ کے ان لوگوں کی تسلی تشفی برابر فرماتی رہیں جنکے خاندان اس تحریک کے سلسلے میں مصائب کا شکار ہوتے ہیں۔ میری علالت بے شک اس وقت میری اور آپ کی کمزوری ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور میرے آقا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے میں نے اس کمزوری پر پوری طرح قابو پا لیا ہے اور میں صحت مند انسانوں سے زیادہ پرعزم اور باحوصلہ ہو کر یہاں کے حکام اور یہاں کے ماحول سے نبرد آزما ہوں۔

میرے الفاظ اور آس پاس بکھرے ہوئے حقائق بھی شاید آپ کی پوری طرح تسلی نہ کر سکیں کیونکہ ممتا کے جذبہ اور شفقتوں کا ادراک کوئی ماں ہی کر سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں میں تسکین کا تجربہ مجھے بھی ہے۔ ممتا کے اس جذبہ کو نہ تو الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہے اور نہ ہی اسے کوئی تصوراتی خاکہ دیا جا سکتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ماں بذات خود ایک ایسا لفظ ہے جس میں مٹھاس ہی مٹھاس ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے قدموں کے نیچے جنت قرار دی ہے اور کسی بھی شخص پر سب سے زیادہ حقوق ماں کے قرار دیئے ہیں تو یہ کوئی سرسری سی بات نہیں۔ ماں کا رشتہ ہی وہ واحد رشتہ ہے جو زندگی کی آخری سانسوں تک

ابتدائی جوش و خروش ہی کی طرح باقی رہتا ہے۔ "بیوی کی محبت" کمزور پڑ سکتی ہے، اولاد ساتھ چھوڑ سکتی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات باپ بھی منہ موڑ سکتا ہے۔ مگر ماں ـــــ اپنی اولاد کو اپنی کوکھ سے جنم دینے کے بعد سے اپنی آخری سانسوں تک یکساں عزیز رکھتی ہے۔ لاکھوں میں ہو سکتا ہے کہ کوئی بدقسمت ماں ہو جو اس جذبہ سے محروم ہو لیکن لاکھوں میں ایک یا چند کی مثال کلیہ نہیں بن سکتی۔

اچھی امی۔ اس لئے میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میرے الفاظ آپ کی مامتا کو مکمل طور پر ـــــــ تسلی دے سکیں گے کیونکہ اگر میں یہ دعویٰ کروں گا تو یہ خلاف حقیقت ہوگا مگر یہ ضرور ہے میں ایمانداری سے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں اپنی موجودہ حیثیت پر پوری طرح مطمئن اور خوش ہوں۔ ظاہر ہے بیٹا خوش تو ماں بھی خوش۔

اولاد مطمئن تو پھر مامتا کو بھی تسکین ہو جانی چاہیئے۔

یہیں تک خط لکھ پایا تھا کہ صدیق راٹھور ایڈووکیٹ ملنے آگئے اور مجھے سپرنٹنڈنٹ جیل کے کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں ان سے ملاقات کرائی گئی۔ واپس پہونچا تو بجلی چلی گئی تھی اور شدید گرمی کے باعث کمرے میں بیٹھنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ میں، منور صاحب اور یوسف بلوچ درخت کے نیچے بیٹھے رہے۔ دوپہر کو کھانا کھا کر نیند آگئی اور پھر شام کی بیٹھک شروع ہو گئی۔ اب رات کے کھانے کے بعد دوبارہ تنہائی ملی تو میں آپ کی خدمت میں پھر حاضر ہو گیا ہوں۔

اس وقت رات کے تقریباً ½۹ بجنے والے ہیں۔ منور صاحب اور یوسف بلوچ کھانے کے بعد ٹہل رہے ہیں اور میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں، اور آپ شاید صبا سلمہا سے باتیں کر رہی ہوں یا ممکن ہے وہ سو گئی ہو۔ یہاں سوائے مچھروں کی زیادتی کے فی الوقت کوئی خاص شکایت

نہیں ہے۔ مچھر ہیں اور بے پناہ ہیں، دو دن تو ان کے رحم و کرم پر گزارے راتوں کو جاگ جاگ کر سوتے رہے یا سو سو کر جاگتے رہے۔ اب مچھروں کو بھگانے والی جلیبی جلانا شروع کردی ہے اور قدرے سکون مل گیا ہے۔ آج حیدرآباد جیل سے کراچی کے تنّو کے قریب سیاسی قیدی واپس دوبارہ یہیں بھیج دیئے گئے ہیں۔ ان میں جمعیت العلمار اسلام کے جناب شیر افضل بھی ہیں اور ہماری جمعیت العلمار پاکستان کے علاقہ رنچھوڑ لائن کے الیاس صدیقی بھی ہیں۔ الیاس نہایت ہی پُرجوش نوجوان ہیں اور انتخابات سے قبل ہی پکڑ لیئے گئے تھے۔ گریجویٹ ہونے کے باوجود انھیں جیل میں سی "کلاس" میں رکھا گیا ہے۔ آج ان سے ملاقات ہوئی، ساری تکلیفوں کے باوجود ان کا حوصلہ بلند ہے۔ یہ وہی الیاس ہیں جو پیارعلی الانہ کے ضمنی انتخاب میں جناب عبیدالرحمٰن ایڈووکیٹ کے پولنگ ایجنٹ تھے اور پولنگ اسٹیشن کے اندر بے ایمانی اور دھاندلی کے خلاف ان کی چیخ و پکار سے تنگ آکر حکمران پارٹی کے جیالوں نے نہتے الیاس کے سینے پر پستول رکھ دیا تھا مگر وہ الیاس کو اس کے موقف یا اس کو اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکے لیکن آج کل یہ الیاس جیل میں ہیں۔ ان کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ کپڑے میلے ہو چکے تھے اور مجھے وہ کچھ دبلے بھی محسوس ہوئے مگر چہرے پر نہ ختم ہونے والے عزم کی جھلک اور زبان پر خدا کا شکر تھا۔

ابھی ابھی یوسف بلوچ نے آکر خبر دی ہے کہ تحریکِ استقلال کے اعجاز محمود، مسلم لیگ کے شیخ لیاقت حسین اور این ڈی پی کے فصیح سالار بھی کراچی جیل پہونچ گئے ہیں انھیں کل اعظم بستی سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ان حضرات کو ہمارے برابر کی بیرک میں رکھا گیا ہے۔ دیکھیں، ہوسکتا ہے کہ کل ملاقات ہوجائے۔

ہماری بیرک میں ہمارے علاوہ جیئے سندھ تحریک کے چند نوجوان اور

سندھ عوامی تحریک کے ابراہیم منشی، فاضل راہو اور اسماعیل سوہو بھی ہیں، ان دونوں تحریکات میں اسماعیل سوہو کے الفاظ میں یہ فرق ہے کہ سندھ عوامی تحریک پاکستان کے اتحاد کی مخالف نہیں اور وہ اس ہی کے ڈھانچہ میں سندھ کے حقوق چاہتی ہے۔ اسماعیل سوہو نے ٹھٹھہ سے صوبائی اسمبلی کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی کوشش کی تھی مگر انھیں ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے گرفتار کر لیا گیا اور ان کے کاغذات نامزدگی قبول نہیں کیے گئے۔ بعد میں الیکشن کمیشن نے ان کو کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کی اجازت دی اور یوں بظاہر ڈپٹی کمشنر کی کھلی زیادتی کا اعتراف خود الیکشن کمیشن نے بھی کر لیا۔ اسماعیل سوہو بہر حال الیکشن نہیں لڑ سکے انھیں ۲۲ فروری کو ہی گرفتار کر کے کراچی جیل پہونچا دیا گیا۔ الیکشن کے متعلق ان کی داستان دوسرے علاقوں سے مختلف نہیں ہے۔ جس کے باعث ان کے حامیوں کو ۱۱ بجے ہی انتخاب کا بائیکاٹ کرنا پڑا۔

فاضل راہو بدین سے امیدوار تھے اور ان کے ساتھ بھی بہت کچھ ہوا، وہ تو کئی ماہ سے جیل میں ہیں۔ ابراہیم منشی سندھی زبان کے شاعر ہیں۔ میر رسول بخش تالپور انھیں سندھ کا حبیب جالب کہتے ہیں۔ دیسے میرے ساتھ ان کا رویہ خصوصی طور پر مشفقانہ ہے۔ یہ تینوں ہی نہیں بلکہ جیئے سندھ تحریک کے ہمارے انتہا پسند نوجوان دوست بھی نکتہ نظر کے بہت سے اختلافات کے باوجود مجموعی طور پر ہمارے ساتھ اخلاق سے پیش آتے ہیں یہ لوگ کئی کئی ماہ بلکہ ایک دو تو کئی کئی سالوں سے جیل میں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کے رشتہ کو کمزور کیے جانے کی باعث یہ سارے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ناقص اقتصادی پالیسیوں نے لوگوں کے دلوں میں جو احساسِ محرومی پیدا کر دیا ہے اس کا ذمہ دار وہ ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہیں۔ نوجوان ذہنوں کو پراگندہ کرنے کے لئے کئی سمتوں سے کام ہوا ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں۔ اس کی جڑیں کتنی

گہری ہیں اور اس کا علاج کیا ہے؟ یہ ایک علیٰحدہ اور طویل موضوع ہے، مگر یہ ضرور ہے کہ یہ مسئلہ قوم کی فوری توجہ کا مستحق ہے اور اسے حل کرنے کے لئے تشدد، دباؤ یا لوگوں کو جیل میں ڈالنے سے صورتِ حال کی اصلاح ممکن نہیں، اصلاح کی واحد قابلِ عمل اور دیرپا صورت یہ ہے کہ بنیادی اسباب کا کھوج لگا کر ان کا حل دریافت کیا جائے اور یہ شاید اس قدر مشکل نہ ہو جتنا کہ لوگوں نے سمجھا ہوا ہے۔ سندھ کا اصل روپ وہی ہے جس کا مظاہرہ قیامِ پاکستان کے وقت ہوا تھا اور لاکھوں مہاجرین کے لئے مقامی مسلمانوں نے چشم و دل وا کر دیئے تھے۔ یہ اصل روپ سندھ کے روایتی اخلاق، مہمان نوازی اور اسلامی رواداری کے پس منظر میں آج بھی موجود ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ وادیٔ مہران پر نفرت و عداوت کی جو دھند احساسِ محرومی، انتہا پسند تحریکات اور غیروں کی سازشوں کے باعث چھا گئی ہے اسے نہایت دانشمندی سے صاف کیا جائے۔ بنگلہ دیش میں انتہا پسند تحریک کا جو عبرتناک انجام ہوا ہے، اس نے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔ اب محض سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔ مگر یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ جہاں تک حقوق کے تعین اور احساسِ محرومی کو دور کرنے کی بات ہے اس کے لئے بڑے سے بڑا قدم اٹھا کر بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی سِرے سے اسلام ہی کا منکر ہے۔ اسے ایک فرسودہ نظام سمجھتا ہے۔ اسے استحصال کا ذریعہ سمجھتا ہے اور عباداتِ اسلامی کو وقت اور مال کا ضیاع تصور کرتا ہے تو اسے مسلمان جیسا نام رکھ کر خود کو مسلمان کہنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ یہی طبقہ دراصل مسلمان بھائیوں میں غلط فہمی پیدا کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے افراد کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور ان سے ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، اگر انھیں بے نقاب کر کے

خود ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو عوام خود ہی انھیں مسترد کر دیں گے۔

میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ میر رسول بخش تالپور سامنے صحن میں اپنی محفل ختم کر کے اُٹھ گئے ہیں اور اپنی بیرک میں جا رہے ہیں۔ یوسف بلوچ سو چکے ہیں آپ بھی اب سونے ہی والی ہوں گی۔ ابا بابا۔ اپی اور سارے بزرگوں کو سلام۔ کنیز باجی، قمر باجی اور اچھی باجی کو بھی سلام کہہ دیں۔ سعدی اب ٹھیک ہوں گی۔ اب تو آپ کو ویسے بھی پریشان نہیں ہونا چاہیئے اللہ تعالےٰ نے آپ کا دل بہلانے کے لئے دو دو بیٹیاں دے رکھی ہیں۔ صبا تو ماشاء اللہ خوب باتیں کرتی ہے وہ آپ کو یقیناً بور نہیں ہونے دیتی ہوگی۔

اچھا خدا حافظ
آپ کا بیٹا
ظہور بھوپالی

والد محترم کے نام

"تشدّد عوام میں ہمیشہ شدید رّدِ عمل پیدا کرتا ہے۔
نیوٹن نے ہر عمل کے ردعمل کی سائنسی تھیوری پیش
کی تھی، حقیقت میں انسانی نفسیات بھی اس سے
کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ بعض اوقات محض رد
عمل انسان سے وہ سب کچھ کرانے پر مجبور کر دیتا ہے
جو عام حالات میں شاید کرنا پسند نہ کرتا ہو۔"

۳ر اپریل ۷۷ء

۲½ بجے دن

اچھے بابا۔ ڈھیر سارے سلام قبول کیجئے۔

آج کئی دن کے بعد فرصت کے لمحات میسّر آئے ہیں تو میں آپ سے نصف ملاقات کے لئے حاضر ہو گیا ہوں، آپ کہتے ہوں گے کہ جیل میں اور مصروفیت کا شکوہ۔ تو بات یہ ہے کہ یہاں آ کر پورے دن کا شیڈول اس طرح بن گیا ہے کہ اس میں تبدیلی کئے بغیر جیل کی دنیا کے باہر کسی سے گفتگو ممکن نہیں ہے۔

صبح ۹ بجے ناشتہ ہوتا ہے پھر ایک درجن اخبارات کا باجماعت مطالعہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں ۱۱ بج جاتے ہیں اس کے بعد کچھ لوگ ملنے آجاتے ہیں۔ ایک بجے کھانا اور ظہر کی نماز کے بعد سونے کا پروگرام بنتا ہے۔ ۵ بجے اُٹھ کر چائے پی جاتی ہے۔ نماز عصر ادا ہوتی ہے۔ پھر آم کے چھوٹے درخت کے قریب منور حسن کے الفاظ میں "نشست"، میر رسول بخش تالپور کے بقول "کچہری" اور یوسف بلوچ کے نزدیک "مجلس" شروع ہو جاتی ہے۔ مغرب کے بعد ریڈیو پاکستان اور بی۔ بی۔ سی سُنا جاتا ہے۔ کھانا کھا کر کچھ لوگ لیٹ جاتے ہیں۔ کچھ اپنی بیٹھک کو جاری رکھتے ہیں اور کچھ پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اکثر عصر اور مغرب کے درمیانی وقفہ میں جیل کی دوسری بیرکوں میں اپنے نظر بند ساتھیوں سے ملنے ملانے کا پروگرام رہتا ہے اور کبھی چودھری ظہور الٰہی، مولانا صلاح الدین وغیرہ صاحبان ہمارے وارڈ میں آجاتے ہیں۔ یوں اس وقت دراصل سونے کا وقت ہے۔ مگر

مجھے آپ کی یاد آئی تو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

میں تقریباً نارمل ہوں بلکہ یہ سوچا کرتا ہوں کہ اس عظیم قومی جدوجہد میں اگر مجھے اپنی قیادت اور کارکنوں کا یہاں ساتھ دینے کا اعزاز حاصل نہ ہو پاتا تو شاید مجھے زندگی بھر اس کا ملال رہتا۔ آپ کی تربیت نے مجھ میں "بے نیازی" "اطمینان قلب" اور ہر حال میں خدا تعالیٰ کے شکر کی خصوصیات پیدا کر دی ہیں اور اس لئے ذہن پر قید و بند کا معمولی بوجھ بھی نہیں ہے۔ آپ کی وجہ سے گھر کے بارے میں بھی مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ صرف امی کا خیال آتا ہے کہ وہ میرے لئے پریشان ہوں گی۔ مگر ان کی دو چھوٹی چھوٹی پرچیاں جو کھانے کے ناشتہ دان کے ذریعے مجھے ملی ہیں، ان سے میری اس فکر کا بھی بڑی حد تک ازالہ ہو گیا ہے۔ دونوں پرچوں میں انھوں نے اللہ تعالیٰ سے میری ثابت قدمی کی دعا کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ماں کی یہ دعا ضرور قبول ہوئی ہوگی ثابت قدمی کی ان دعاؤں کی ہمیں اب زیادہ ضرورت ہے، ایک تو قید و بند کی صعوبتیں دوسرے یہاں خرید و فروخت کا کاروبار شروع کر دیا گیا ہے۔ ہمارے وارڈ سے جئے سندھ تحریک کے ۶ رہنماؤں کو کل وزیر اعلےٰ اور وزیر اعظم سے مذاکرات کے لئے لیجایا گیا ہے۔ وہ پھر واپس نہیں آئے بلکہ شام کو ان کا سامان بھی منگوا لیا گیا۔ کچھ کا کہنا ہے ان سے کچھ سمجھوتہ کیا گیا ہے اور انھیں چھوڑ دیا گیا ہے اور ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ مذاکرات مکمل نہیں ہو سکے۔ خود ان میں باہم اختلاف ہے اس لئے فی الحال انھیں لانڈھی جیل بھیج دیا گیا ہے۔ صورتحال کچھ بھی ہو اس سے حکومت کے عزائم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہماری سوچی سمجھی رائے تو یہ ہے کہ حکمران جماعت پنجاب کو بلیک میل کرنے کے لئے سندھو دیش تحریک کو ہوا دینا چاہتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اندرونِ سندھ حکومت کے حق میں مظاہروں کا پروگرام ہو۔ بعض حضرات نے ان سے بھی آگے بڑھ کر سنگین خدشات کا اظہار

کیا ہے۔ مگر مضبوط دلائل اور حقائق سامنے ہوتے ہوئے بھی دل انھیں ماننے اور قلم انھیں لکھنے پر تیار نہیں ہوتا۔ سندھ عوامی تحریک کے تین حضرات جو جیئے سندھ تحریک کے نوجوانوں کے ساتھ ہی کمرے میں تھے ابھی موجود ہیں۔ یعنی اسماعیل سوہو، ابراہیم منشی، اور فاضل راہو۔ ان کا خیال تو یہ ہے کہ سمجھوتہ ہونا مشکل ہے لیکن اگر جیئے سندھ والوں نے بھٹو صاحب سے کوئی سمجھوتہ کر بھی لیا تو اس سے حکمراں جماعت کو کوئی فائدہ عملی طور پر نہیں پہونچ پائے گا۔ صورتحال کچھ بھی ہو۔ یہ پس پردہ باتیں دراصل اس گھبراہٹ کا مظہر ہیں جس کا ڈولتا ہوا اقتدار شکار ہے اور جس کے باعث تنکوں کا سہارا بھی حاصل کرنے سے گریز نہیں کیا جا رہا ہے۔

کل شام مفتی محمد حسین صاحب، جمعیت العلماء پاکستان سکھر کے صدر[1]، جماعت اسلامی کے مفتی دائم الدین صاحب اور جناب غازی اور جمعیت العلماء اسلام کے مولانا مراد صاحب ہمارے وارڈ میں پہونچ گئے ہیں۔ انھیں جیئے سندھ تحریک کے نوجوانوں سے خالی ہونے والی جگہ میں رکھا گیا ہے۔ صبح میں نے سپرنٹنڈنٹ سے بات کی اور زور ڈال کر مولانا ذکریا، مولانا غوث محمد شاہ جیلانی، مولانا محمد رمضان، مولانا عبدالسبحان، مولانا عبدالحق (مسجد فلاح والے) مولانا عبدالبعث، مولانا نورالہدیٰ، مولوی شیر افضل اور ڈاکٹر مبین اختر صاحبان کو بھی "سی" کلاس کی بیرک سے اپنے وارڈ میں بلوا لیا ہے۔ ہمارے لمبے چوڑے احاطہ میں انتہائی شمال کی طرف جو اجڑی ہوئی عمارت ہے جس کے متعلق میں نے اپنے پچھلے خط میں آپ کو لکھا تھا کہ اسے "زیادہ اعزاز بخشنا چاہیں تو اسے بارہ دری کہہ لیں، اگرچہ کہ اس کے بارہ دروازے نہیں ہیں" اس کی صفائی کرا کر ان حضرات کا وہاں انتظام کرا دیا ہے۔ اس پتھر کی بنی ہوئی عمارت کو نیم کے درخت نے اپنی گھنی چھاؤں میں لے رکھا ہے یوں ان علماء کرام کو عادی مجرموں کے چرس کے دھوئیں اور کس قدر دھوپ

[1] مولانا سید اقبال حسین شاہ صاحب

کی تپش سے نجات مل گئی ہے۔ لیکن ابھی سینکڑوں قومی اتحاد کے کارکن "سی" کلاس کی تنگ و تاریک بیرکوں میں نہایت حوصلہ کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔ میں کل ان بیرکوں میں گیا تھا وہاں کارکنوں کے حوصلے بہت بلند دیکھے۔ ان کارکنوں میں سے بھی کچھ نے میری توجہ علماء کرام کی طرف مبذول کراتے ہوئے خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کا بہتر انتظام ہو جائے تو اچھا ہے۔ خود علماء کرام نے اشارتاً بھی ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کارکنوں کو اپنے علماء کرام سے والہانہ عقیدت و احترام کی جو لگن ہے اس کے پیشِ نظر خدا کا شکر ہے کہ ان کی دلی خواہش آج پوری ہو گئی۔ کل وہیں اپنے جیکب لائنز کے کارکن چوہدری محمد صدیق سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے دُور ہی سے مجھے دیکھ کر لوہے کی سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر " V " کا نشان بنایا اور نعرہ لگایا۔ میں ان کے قریب گیا اور پوچھا کہ کیوں پیپلز پارٹی چھوڑنے کا اب ملال تو نہیں ہے؟ انھوں نے پرجوش انداز میں جواب دیا۔

"نہیں! انشاء اللہ ہل چلے گا۔ آپ ہم لوگوں کی طرف سے متفکر نہ ہوں، ہمارے حوصلے بہت بلند ہیں۔"

جیکب لائنز کے ہی نظام تو ہمارے وارڈ کے ساتھ والی بیرک چھوڑ کر دوسری بیرک میں ہیں۔ ایک بار اُن سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا بھی حوصلہ بلند ہے۔ منصور صاحب سے کہہ دیں کہ وہ نظام صاحب کے لئے متفکر نہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس حوصلے اور جرأت کا مظاہرہ یہاں ہمارے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کارکن کر رہے ہیں اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تشدد لوگوں کے حوصلے پست نہیں کر سکتا ہے بلکہ جبر و تشدد اور ظلم و زیادتی نے ان کے سوئے ہوئے جذبہ حریت کو بیدار کر کے انھیں ایسا مجاہدانہ

جوش و ولولہ پیدا کر دیا ہے کہ اب حکومت چاہے کچھ کر لے اس تحریک کو دبا نہیں سکے گی۔

یہاں جیل میں عجیب عجیب واقعات اور انوکھے تجربات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سیاسی قیدیوں سے قطع نظر متعدد قیدی ایسے بھی ملے جن کے مقدمات کئی کئی سال سے زیرِ سماعت ہیں اور وہ انصاف کے انتظار میں جیل میں پڑے ہیں۔ آپ کو شاید یاد ہو، جب جتوئی صاحب ملک سے باہر گئے تھے تو اس وقت کے قائم مقام وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے کھوڑو صاحب نے بدین جیل کا دورہ کیا تھا اور کئی قیدیوں کی رہائی کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ وہ قیدی چھوڑ دیئے گئے۔ بعد میں ان کے ان احکاماتِ خسروانہ کو "اوپر والوں" نے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا تو ساری ذمہ داری آئی جی جیل خانہ جات اور جیل کے عملہ پر ڈال کر کھوڑو صاحب بری الذمہ ہو گئے۔ چھوڑے ہوئے قیدیوں کو تو دوبارہ پکڑ ہی لیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ سپرنٹنڈنٹ جیل امجد خاں غوری، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اختر حسین اور کلرک قادر بخش کو معطل کیا گیا اور کراچی جیل میں ڈال دیا گیا۔ فوری تحقیقات کا شاہی حکم بھی صادر ہوا مگر گیارہ ماہ سے زائد ہو چکے ہیں تحقیقات تو کیا ہوتی ایسا نظر آتا ہے ان کی معطلی کے ساتھ ساتھ انصاف کرنے والی مشینری کو بھی معطل کر دیا گیا ہے۔ یہ لوگ جب سے کراچی جیل میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ایک دو نہیں درجنوں ایسے کیس ہیں جو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ نہ تو ان کا قصور ہی ثابت کیا جاتا ہے اور نہ ہی وہ بے قصور گردانے جاتے ہیں تاکہ ان کی رہائی عمل میں آئے۔

جیل میں جو کھانا خصوصاً سی کلاس کے قیدیوں کو دیا جاتا ہے۔ جمعہ خان شاید اپنی بھینسوں کو اس سے بہتر چارہ دیتے ہوں گے۔ بس یوں سمجھئے کہ دو چار دن میں قیدی کا معدہ اسے ہضم کرنے کا عادی ہو جائے تو گزر ہو جاتی

ہے۔ ورنہ پھر یہ کھانا اسے مریض بناکر ہی چھوڑتا ہے۔ جیل کی انتظامیہ سے بات کرو تو وہ فنڈ میں کمی کا رونا روتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے بتایا کہ ٹھیکیدار کو جن نرخوں پر ٹھیکے دیئے جاتے ہیں وہ اس قدر کم ہیں کہ ان میں معیاری سامان کی فراہمی ممکن ہی نہیں مثلاً انھوں نے بتایا کہ بکری کا گوشت جو "اے" اور "بی" کلاس کے قیدیوں یا مریضوں کو دیا جاتا ہے وہ ٹھیکیدار سے جیل انتظامیہ دس روپے سیر کے حساب سے خریدتی ہے جبکہ مارکیٹ میں بکری کا گوشت اٹھارہ، بیس روپے سیر فروخت ہوتا ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ یہاں گوشت نما کیا شئے فراہم کی جارہی ہے۔

یہاں ہماری خدمت کے لئے جیل کے قواعد کی رو سے ہمیں قیدی برداشتی کے طور پر ملے ہوئے ہیں۔ میرے پاس جو نوجوان ہے اس کا نام ممتاز خاں نیازی ہے وہ میانوالی کا رہنے والا ہے اور قبلہ مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی کا معتقد ہے اور حال ہی میں کراچی جیل پہونچا ہے اس کا تعلق فوج سے ہے جہاں وہ ڈرائیور ہے۔ ایک فوجی گاڑی غلطی سے جل جانے کی ذمہ داری اس پر آگئی اور اسے نوکری سے نکال کر جیل پہونچا دیا گیا۔ بہت زیادہ خدمت گزار، چاق و چوبند نوجوان ہے نمازی ہے اور بیڑی سگریٹ تک کا عادی نہیں ہے۔ ورنہ یہاں تقریباً ہر قیدی کا پسندیدہ "کے ٹو" سگریٹ ہے اور میں نے اسی لئے آپ سے منگوائی تھیں۔

ممتاز بھارت میں پاکستان کا جنگی قیدی رہ چکا ہے اور مشرقی پاکستان میں فوجی ڈرائیور کی حیثیت سے مکتی باہنی اور بھارتی فوجوں سے لڑائی کے آخری مراحل تک شریک رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار کیوں ڈالے ۔۔ تو اس نے بتایا کہ ہمارے پاس فضائی کور نہ ہونے کے برابر تھا۔ توپخانہ کا سامان اور گولہ بارود قریب قریب ختم ہوچکا تھا۔ پھر بھی ہم

لڑتے رہے۔ مغربی پاکستان سے ہتھیار ڈالنے کا حکم ملنے کے باوجود جنرل نیازی اور اُن کے ساتھی جذباتی تھے اور ہر شخص جذبۂ شہادت سے سرشار تھا مگر بار بار ہمیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ ہم اپنی جان دے سکتے تھے مگر ۵۰ ہزار سول انتظامیہ اور مغربی پاکستان کے افسران اور ان کے خاندان کی حفاظت ہمارے بس میں نہیں رہی تھی۔ ہمیں تین ہفتے تک کسی طرف سے کوئی کمک بھی نہیں ملی اور بالآخر ہمیں ۵۰ ہزار افراد جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے کے تحفظ کے لئے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

یہ ایک ان پڑھ اور عام فوجی کا تاثر ہے۔ اس سے بڑی حد تک جنرل نیازی کے دعووں کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں نے ممتاز سے جنرل نیازی کے بارے میں بھی معلوم کیا۔ تو وہ ان کا مدّاح معلوم ہوتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا یقین ہمیں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو اسی وقت ہو گیا تھا جب کہ مشرقی پاکستان کے سیاسی مسئلہ کو فوجی طاقت کے ذریعے حل کرنے کا راستہ اختیار کیا گیا۔ قبلہ مولانا شاہ احمد نورانی نے ۱۸ یا ۱۹ مارچ کو آرام باغ کے جلسہ عام میں اس منصوبہ کی نشاندہی کردی تھی اور ۲۴ مارچ کو ڈھاکہ سے کراچی پہنچ کر انھوں نے اپنے خلاف ہونے والے مظاہرے کے باوجود فوجی کارروائی کی مخالفت کی تھی مگر لوگ اس وقت کسی اور ہی موڈ میں تھے۔ اصل میں طاقت کبھی عوامی جوش و خروش کو کچل نہیں سکتی۔ اب مغربی پاکستان میں بھی مقبول عوامی تحریک کو کچلنے کے لئے "کرسی کی طاقت" پر بھروسہ کیا جا رہا ہے۔ آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ طرزِ عمل کہاں تک کامیاب ہو سکے گا۔ تشدد عوام میں اور زیادہ ردِّ عمل پیدا کرے گا۔ نیوٹن نے ہر عمل کے ردِّ عمل کی سائنسی تھیوری پیش کی تھی حقیقت میں انسانی نفسیات بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ بعض اوقات محض ردِّ عمل انسان سے وہ سب

کچھ کرانے پر مجبور کر دیتا ہے جو وہ شاید عام حالات میں کرنا پسند نہ کرتا ہو۔
میں کہاں سے کہاں نکل گیا باتیں جیل کی ہو رہی تھیں۔ یہاں سب سے زیادہ تکلیف دہ وارڈ "بند وارڈ" کہا جاتا ہے اور یہاں عموماً متشدد عادی مجرم رکھے جاتے ہیں ان سے کام بھی سخت لیا جاتا ہے۔ اب کھلی بیرکیں ضرورت سے زیادہ بھر جانے کے باعث بعض سیاسی قیدی بند وارڈ میں بھی رکھے جا رہے ہیں۔ لیاری سے نکلنے والے جلوس کے قائد عبدالستار افغانی اور بوہرہ پیر کے شبّیر احمد مشرقی کو بند وارڈ میں رکھا گیا ہے۔ ہم نے اس پر شدید احتجاج کیا ہے اگر ہماری کوشش کامیاب ہو گئی تو کل تک انھیں وہاں سے کھلی بیرک میں منتقل کرانے میں انشاءاللہ کامیاب ہو جائیں گے۔

سب لوگ سو رہے ہیں۔ مجھ پر بھی کچھ نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔ اس لئے اب اجازت دیجئے۔ عام کارکنوں اور گھر والوں کو سلام۔ کارکنوں سے پوچھ لیجئے گا کہ کوئی شکایت تو نہیں ہے۔ کہیئے گا ان کا نمائندہ بھی نظامِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کے قافلہ میں علالت کے باوجود کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ الحمدللہ۔

آپ کا بیٹا
ظہور بھوپالی

بیگم قمرالنساء قمرؔ کے نام

جو حسنِ اتفاق سے میری پھوپھی بھی ہیں

بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ پنجاب کی خواتین نے انہیں ووٹ دے کر جتایا ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ پنجاب کے شہروں کی تو الگ بات ہے شاید ہی کوئی تحصیل ایسی ہو جہاں خواتین بھٹو صاحب کے اس بہتان سے غضب ناک ہو کر شاہراہوں پر نہ آچکی ہیں۔

۱۰؍ اپریل ۷۷ء

ڈیر قمر باجی۔ جیل کا سلام قبول کیجئے[۱]

کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے کچھ گفتگو کی جائے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ زندان کی مصروفیات دم ہی نہیں لینے دیتیں لانڈھی کورنگی میں آپ نے خواتین کا زبردست جلوس نکالا تو میں نے سوچا مبارکباد دے ڈالوں۔ لیکن سوچ کو تحریری شکل دینے کا موقع بھی نہیں ملا۔ راجہ حق نواز ایڈوکیٹ آئے تو انہوں نے لانڈھی کورنگی کے مظاہرے اور جلوس کی بہت تعریف کی اور میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ آخر کو میری پھوپھی ہیں نا۔ اور پھر آپ نے اچھی باجیؔ سے بھی جلوس کی قیادت کراڈالی آپ دونوں بہنوں نے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے جس جرأت اور ہمت کا مظاہرہ کیا تھا یہاں تک کہ پولیس سے میگا فون لے کر ۸۹ کے بس اسٹاپ پر جو تقریر آپ نے کی تھی اس کی تعریف اتنی کی گئی کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ اس میں بہت زیادہ مبالغہ ہے بھلا کراچی اور وہ بھی لانڈھی کورنگی کی خواتین اتنی پرجوش کہاں ہوسکتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے کراچی کے ہر گوشے سے خواتین کی جرأتمندانہ مظاہروں کی تفصیلات آتی رہیں میرا یقین بھی پختہ ہوتا رہا اور میں بالآخر آپ کی ہی نہیں پوری کراچی کی خواتین کی جرأت کا قائل ہوگیا

تقریباً روزانہ ہی آپ کا نام اخبارات میں دیکھ کر خیال آتا تھا کہ لکھنے بیٹھ جاؤں۔ مگر احباب نے فرصت نہ دی۔ اب جبکہ

۱؎ بیگم زیب النساء نزہت

کراچی میں ریگل بس اسٹاپ سے خواتین کا تاریخی اور زبردست جلوس نکلا اور اس میں قیادت کرنے والی خواتین میں آپ کا نام بھی پڑھا تو بے اختیار آپ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس لئے کہ اب آپ مبارکباد کی بہت ہی زیادہ مستحق بن گئی ہیں اور سال بھر سے پرورش پانے والی آپ کی دلی خواہش کی تکمیل بھی ہو گئی ہے اب پاکستان کے مرد بھی آپ خواتین کے پروگراموں پر معترض ہونے کے بجائے ایک دن کا پروگرام پڑھ کر دوسرے پروگرام کے لئے بے چینی سے منتظر رہتے ہیں ہم لوگوں کی بھی دراصل مصروفیات یہی ہیں۔ کچھ وقت آپ باہر والوں کی سرگرمیاں پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ کچھ اس پر تبصرہ کرنے اور تبصرے سننے میں باقی کھانے، سونے، محفلیں سجانے نئے آنے والوں کا استقبال کرنے کی نذر ہو جاتا ہے۔

یہاں کراچی سنٹرل جیل میں فی الوقت بھی قومی اتحاد کے ڈیڑھ ہزار کے قریب کارکن ہیں جن میں تقریباً ۳۰ بی کلاس کے اور اے کلاس کے تین یعنی منور حسن، پیش امام اور چودھری ظہور الٰہی صاحبان۔

چودھری ظہور الٰہی اور جسارت والے صلاح الدین یہاں ایک سال سے زائد عرصہ سے براجمان ہیں۔ یہاں علماء بھی ہیں، طلباء مزدور اور سیاسی جماعتوں کے کارکن بھی۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لئے اتحاد کے نامزد کردہ نمائندے بھی۔ اور نہ کردہ جرائم کی سزائیں کاٹنے والے بعض سرکاری ملازم بھی۔ ان دنوں جس سے ملو۔ جس سے بات کرو وہ پاکستانی خواتین اور علماء کرام کو خراج تحسین پیش کرتا نظر آتا ہے دن بھر ہر آہٹ پر نئے آنے والے مہمان کا گمان ہوتا ہے اور ہر لمحہ کسی نئی خبر کا انتظار۔ مگر کوئی مضمحل نہیں ہے نہ ہی کوئی افسردہ ہے۔ جیل کی مختلف بیرکوں میں چپہ چپہ سے لائے گئے کارکنوں سے

سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں وہی انتخابات کے دوران کا جذبہ نظر آیا۔
کل جبٹ لینڈ لائنز کے مولانا شمشیر علی اور ان کے ساتھیوں انور حسین، نور النبی، محمد فرید، حمید اللہ، اعظم ؒی، محمد عثمان اور محمد ادریس سے ملاقات ہوئی ان سب لوگوں نے میری انتخابی مہم میں بہت کام کیا تھا۔ مجھے دیکھکر ایسے خوش ہوئے اور پر جوش نعرے لگانے لگے کہ جیسے وہ جیل میں نہیں پکنک منانے آئے ہوں۔ اس تحریک کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ علماء اور مساجد کے آئمہ اور خطباء کی بھی ایک بڑی تعداد جیل لائی گئی ہے۔ پٹیل پاڑہ، جہانگیر روڈ اور لسبیلہ کے کوئی ایک درجن آئمہ کرام سے کل ملاقات ہوئی۔ ۵ علماء کرام جو علماء کے جلوس میں گرفتار ہوئے تھے وہ تو ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ اس طرح ہر بیرک میں کچھ نہ کچھ علماء کرام موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر بیرک میں باقاعدہ جماعت سے نمازیں ادا ہو رہی ہیں۔ بعض بیرکوں میں درس قرآن بھی جاری ہے۔ اکثر میلاد پاک کی محفلیں بھی سجتی ہیں اور رات کو اذانیں دینے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ مختصر یہ کہ یہاں کا ہر قیدی ایک عجیب سے قابل فخر جذبہ سے سرشار ہے۔

گزشتہ کئی دنوں سے یہاں یہ خبر بڑے زور و شور سے گرم ہے کہ اب خواتین کو جیل لایا جانے والا ہے۔ ہم جس وارڈ میں ہیں۔ وہ کسی زمانے میں خواتین کا وارڈ تھا۔ تین چار دن سے اس وارڈ کو خالی کرانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جیل انتظامیہ کی ان کوششوں نے لوگوں کو اور زیادہ شک و شبہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ قومی اتحاد کے سارے رہنماؤں کی سکھر منتقلی کے احکامات آ گئے ہیں مگر سب نے متفقہ فیصلہ کے بعد سکھر جانے اور وارڈ خالی کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد جمعرات کو بالجبر بھیجنے کے لئے فورس بلائی گئی اور یہاں ہنگامہ

ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل سے میں نے، منور صاحب اور چودھری ظہور الٰہی صاحب نے مذاکرات کئے اور یہ طے کیا کہ جو لوگ اپنی مرضی سے سکھر جانا چاہیں انہیں تو فی الحال جانے دیا جائے اور اس فیصلہ کی روشنی میں سکھر کے مفتی محمد حسین صاحب اور انکے چار ساتھی اور تین دیگر رہنما اپنی مرضی سے جمعرات کو سکھر چلے گئے اور یوں وقتی طور پر ہنگامہ فرو ہو گیا۔ جمعہ کے دن پھر مذاکرات ہوئے اور طے پایا کہ مولانا ذکریا، مولانا غوث محمد شاہ جیلانی، ضیاء الدین بیگ فصیح سالار اور عبدالستار افغانی کو بھیجدیا جائے۔ مگر طے یہ پایا کہ انھیں ٹرین میں فرسٹ کلاس کی ریزرویشن کرا کے لے جایا جائے۔ چنانچہ کل شام ان حضرات کو جیل سے لے جایا گیا۔ اور جب اسٹیشن پہنچے تو وہاں ریزرویشن وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ انھیں تھرڈ کلاس کے ہی ایک ڈبہ میں سوار کرانے کی کوشش کی گئی تو ان حضرات نے سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ اس گڑبڑ میں اسٹیشن پر ایک بڑا عوامی ہجوم جمع ہو گیا جو ان رہنماؤں کی حمایت کر رہا تھا نتیجہ میں پولیس کو ان رہنماؤں کو واپس جیل لانا پڑا۔ نتیجہ میں آج ہم نے دوبارہ یہ طے کر لیا ہے کہ اب کوئی سکھر نہیں جائے گا اور نہ ہی کسی کو جانے دیا جائے گا۔ جیل انتظامیہ نے آج کے لئے ریزرویشن کرائی تھی ہمارے انکار کی وجہ سے اسے منسوخ کرانا پڑی۔ اس طرح فی الحال ہم سب مشترکہ طور پر کراچی جیل میں ہی موج کر رہے ہیں اور خواتین کے لئے اس وارڈ کو خالی کر کے جیل انتظامیہ کے حوالے کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں۔

یہاں کل کا دن لاہور کے بارے میں طرح طرح کی خبریں سننے میں صرف ہوا۔ بی۔ بی۔ سی کی رات کو خبریں سننے کے بعد دن بھر

ملنے والی خبروں کی تصدیق ہوئی۔ عورتوں کے جلوس کے ساتھ لاہور میں جو تشدد ہوا ہے اس کی تفصیلات یہاں ۲ بجے دن سے ہی پہونچنا شروع ہو گئی تھیں۔ چودھری ظہور الٰہی صاحب نے نہایت صبر واستقامت کے ساتھ اپنی بیٹیوں کے زخمی ہونے کی اطلاع خود آکر ہمیں دی۔ پوری جیل میں زبردست جوش وخروش پھیل گیا تھا۔ مختلف بیرکوں سے قومی اتحاد زندہ باد اور ہل چلے گا کے فلک شگاف نعرے برابر سنائی دے رہے تھے۔ آج تقریباً ہر بیرک میں قرآن خوانی ہوئی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی اور لاہور کے شہداء کو خراج عقیدت اور زندہ دلان پنجاب کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ ہم نے اپنی بیرک پر سیاہ جھنڈا لہرا دیا ہے۔ بیرک ۱۶ پر بھی ایک سیاہ جھنڈا لہرا رہا ہے۔

آپ سوچتی ہوں گی کہ سیاہ جھنڈا کہاں سے آ گیا۔ اس کے لئے ہمیں تھوڑی سی عقل استعمال کرنا پڑی ہم نے جیل کی انتظامیہ سے سیاہ ڈالرانک لاکر دینے کے لئے کہا۔ وہ یہ سمجھے کہ شاید انھیں لکھنے پڑھنے کے لئے چاہیئے۔ نتیجتاً ہمیں سیاہ روشنائی لاکر دے دی گئی۔ سیاہ روشنائی آ گئی تو یوسف بلوچ اور جنید فاروقی نے جیل کی فراہم کردہ ایک سفید چادر کو پھاڑا اور جھنڈا بنا کر اس میں رنگا۔ اور۔ لیجئے۔ سیاہ جھنڈا تیار ہو گیا۔ نیم کی ٹہنیوں سے اس کے لئے ڈنڈا تیار کیا گیا پھر بیرک پر بجلی کے کھمبے سے باندھ کر لہرا دیا گیا۔ سفید چادر کا جو حصہ ہم نے بچا لیا تھا اس پر کوئلہ سے بینر تیار کر لیا گیا۔ جنید نے کوئلہ سے جگہ جگہ دیواروں پر نعرے تحریر کر دیئے اور یوں یوم احتجاج منا لیا گیا۔

البتہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ۱۶ نمبر بیرک والوں نے سیاہ جھنڈا

کس طرح تیار کیا۔ ظاہر ہے انھوں نے بھی کوئی نہ کوئی ترکیب لڑا ہی لی ہوگی۔

یہیں تک لکھ پایا تھا کہ مغرب کا وقت ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد ریڈیو پاکستان اور بی بی سی کے انتظار میں محفل سج گئی۔ بی بی سی کی خبریں جب سنی جا رہی تھیں تو نعرے لگنے شروع ہو گئے۔ ان نعروں کا مقصد دراصل خوش کن خبروں کو ایک بیرک سے دوسری بیرک پہونچانا ہوتا ہے۔

یہ بھی اس ملک کی عجیب وغریب ستم ظریفی ہے کہ اپنے ملک کی خبریں سننے کے لئے دوسرے ملکوں کے ریڈیو سنے جاتے ہیں۔ کل لاہور میں پنجاب اسمبلی کے اجلاس کا ڈھونگ رچایا گیا تھا اس موقعہ پر لاہور میں جو کچھ ہوا وہ پوری دنیا کے ہر ریڈیو کی پہلی خبر تھی بی بی سی ورلڈ نیوز سروس میں وائس آف امریکہ اور مغربی جرمنی کی خبروں میں ۔ اسے اہم ترین خبر کی طرح نشر کیا گیا۔ لیکن پاکستان ریڈیو نے دنیا بھر کی خبروں کے بعد ایک غیر اہم خبر کی طرح اسے نشر کیا اور وہ بھی توڑ پھوڑ اور چند شر پسندوں کا راگ الاپ کر۔ پھر رات گیارہ بجے کی خبروں میں اسی طرح غیر اہم انداز میں ۸ آدمیوں کی ہلاکت کی خبر نشر کی۔ گویا ریڈیو پاکستان کے نزدیک ۸ آدمیوں کے ہلاک ہونے کی خبر سے زیادہ اہم اراکین اسمبلی کا حلف اٹھانا سرحد کابینہ کی رسم حلف برادری سے لے کر زائر اور بیروت کی خبریں تھیں۔

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جانتے ہوئے کہ ملک کا بچہ بچہ اب پاکستانی خبریں سننے کے لئے بیرونی ممالک کے ریڈیو سنتا ہے۔ خبروں کو غیر اہم بنا کر یا توڑ مروڑ کر پیش کرنے یا چھپا جانے سے کیا

مقصد ہوتا ہے۔ یہ حرکت تو عوامی اشتعال کو ہوا دینے کے مترادف ہے۔ فی زمانہ کسی خبر کو چھپایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی کسی علاقہ کے انسانوں کے حقوق مسلسل پامال کر کے اس کی پردہ پوشی ممکن ہے موجودہ دور میں مواصلاتی رابطے اس قدر ترقی یافتہ ہیں کہ اب کوئی خبر کسی بھی ملک کی عوام سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ پاکستان میں ہونے والے واقعات پر پوری دنیا کی نظر ہے اور بین الاقوامی پریس کے نمائندے پاکستان میں موجود ہیں۔ پھر ریڈیو۔ ٹی۔ وی پر سرکاری ڈھونگ یا پریس سنسر شپ کا کیا فائدہ ہے۔

اس قومی تحریک کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ جیالے کارکنوں ہمدرد اور محب اسلام عوامی اور سرکاری افراد نے تحریک کی خبریں پھیلانے میں اخبارات، ریڈیو، ٹی۔ وی سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے ان کا سینہ گزٹ سب سے بڑا ریڈیو ہے۔ ہم لوگ جو جیل کی چہار دیواری کے اندر ہیں۔ ہمیں باہر کی خبروں سے بالکل ناواقف ہونا چاہیئے مگر آپ یقین کیجیے صرف کراچی ہی نہیں ملک کے کسی بھی حصہ میں کوئی تصادم ہوتا ہے۔ تشدد یا گرفتاری ہوتی ہے تو چند گھنٹوں میں ہمیں بھی خبر مل ہی جاتی ہے۔ جب لوگ اتنے زیادہ متجسس اور سرگرم ہوں تو پھر خبروں پر سرکاری پابندیاں لوگوں کو بے خبر تو کیا رکھ سکتی ہیں۔ حکومت پر سے رہا سہا اعتبار بھی اٹھا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو پاکستان کی سچی خبروں پر بھی لوگ کم ہی اعتبار کرتے ہیں اگر ریڈیو پاکستان کسی حادثہ میں ہلاک ہونے والوں کی کوئی تعداد بیان کرتا ہے تو لوگ اسے فوراً کم از کم ۱۰ سے ضرب دیتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سنکر ایک اندازہ ضرور ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شاید ملک کا وزیر اعظم صرف ریڈیو پاکستان

ہی سنتا ہے۔ ورنہ ریڈیو چین ہے، سکون ہے اور سب ٹھیک ہے کا راگ نہ الاپتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف مذاکرات کی دعوت ہے۔ دوسری طرف گرفتاری، لاٹھی، گولی اور آنسو گیس بھی جاری ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس ہو رہے ہیں وزراء اعلیٰ کا انتخاب اور پھر وزراء حلف بھی اٹھا رہے ہیں خواتین اور اقلیتوں کی نشستوں کے انتخابات بھی ہو رہے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ سارے کام معمولات کے مطابق پرامن ماحول میں جاری ہیں۔ سچ پوچھئے تو قومی اتحاد کے رہنماؤں کو بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ وہ عوام میں اشتعال اور ردعمل پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنوا رہے اور تحریک ان کی ان حرکتوں سے روز بروز ہمارے توقعات سے بھی کہیں زیادہ شدت خودبخود پکڑتی جا رہی ہے۔ گزشتہ ہفتے بی بی سی نے اپنے ایک تبصرے میں کہا تھا کہ پنجاب نے اب کروٹ لینا شروع کی ہے اور آج بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پوری طرح بیدار ہو کر کھڑا ہو گیا ہے۔

بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ پنجاب کی خواتین نے انھیں ووٹ دے کر جتایا ہے۔ اور اب صورتحال یہ ہے کہ پنجاب کے شہروں کی تو الگ بات ہے شاید ہی کوئی تحصیل ایسی ہو جہاں خواتین بھٹو صاحب کے اس بہتان سے غضب ناک ہو کر شاہراہوں پر نہ آچکی ہوں۔

آپ لوگ یقیناً میری طبیعت کے بارے میں متفکر رہتے ہوں گے۔ ظاہر ہے میں ابھی پوری طرح ٹھیک تو نہیں ہوں مگر تشویش کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارا وارڈ ان دنوں ملیریا کی لپیٹ میں

ہے ۔پہلے میرے برداشتی ممتاز کو ملیریا نے آگھیرا اور وہ جیل کے اسپتال ہیں ہے ۔ پھر منور صاحب کے برداشتی پر ملیریا کا حملہ ہوا اور وہ بخار میں پڑا ہے ۔اب اس وقت یہاں کا باورچی ذکاءاللہ بھی بخار چڑھنے کی شکایت کر رہا ہے ۔خدمت کرنے والے بیمار ہو جائیں تو طبیعت پر خود بھی کسلمندی طاری ہونے لگتی ہے ان لوگوں نے ہماری بہت خدمت کی ہے ۔یہ جیل کے قیدی ہیں مگر جو لوگ ہمیں ملے ہیں وہ عادی مجرم نہیں ہیں ۔خدا ان کو جزاء خیر دے اور انھیں بہتر مستقبل کے ساتھ اچھا اور اعلیٰ مسلمان بننے میں ان کی مدد فرمائے ۔آمین ۔

یہاں جیل میں آنے کے بعد مجھے اپنے جرائم کی تفصیلات کا علم ہوا ہے ۔جب ۲۵ مارچ کو مجھے گھر سے گرفتار کیا گیا تو ایک ماہ کی امتناعی نظر بندی کا حکم دیا گیا تھا ۔اور حکمنامہ میں تحریر تھا کہ آپ کو امن عامہ کے خلاف کسی بھی ممکنہ اقدام سے روکنے کے لئے نظر بند کیا جا رہا ہے ۔اب اس کی وجوہات تحریری طور پر مجھے دی گئی ہیں ۔ان میں ۱۸ مارچ کو جنگ میں شائع ہونے والے میرے کسی بیان کا بھی ذکر ہے اور بقول ہوم سیکرٹری صاحب کے میرا بیان میں یہ کہنا کہ" پولس لوگوں کے گھروں میں گھس کر انھیں گرفتار کر رہی ہے" اشتعال کا سبب بنا ہے ۔اور ظاہر ہے یہ دستور کی بہت بڑی خلاف ورزی ہے ۔مجھے ۳ اپریل کو جیل ہی کے اندر ایک ٹریبونل کے سامنے پیش کیا گیا جس میں ایک اور مقدمہ کا بھی انکشاف ہوا ۔مقدمہ یہ ہے کہ میں نے بوستان علی ہوتی کے ساتھ ۱۶ مارچ کو فریئر روڈ پر ہنگامہ کیا ۔اس کے لئے میں بس کے ذریعے جائے واردات پر پہونچا ۔لوگوں کو جلوس اور

نعروں پر اکسایا اور پولیس پر پتھر پھنکوائے جس کے بعد موقع پر ہی بوستان علی ہوتی وغیرہ گرفتار ہوگئے اور بقول پولس "میں فرار ہوگیا اور پولس مجھے گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ جرم کی نوعیت تو خیر جو کچھ بھی ہو خدا کا شکر ہے پولس نے مجھے بس کے سفر اور بعد میں بھاگنے کے قابل تو سمجھا۔ یہ واقعہ ۱۶ / مارچ کا ظاہر کیا گیا ہے جبکہ ۲۶ / مارچ کو میری گرفتاری کے دوسرے دن میرا ڈاکٹری معائنہ ہوا تو سکھر منتقلی کے سلسلہ میں دونوں ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر مجھے ہوائی جہاز سے سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی اور حکومت کو میری سکھر منتقلی روک کر مجھے کراچی جیل میں ہی رکھنا پڑا۔

یہاں پر جس قدر بھی لوگ ہیں وہ ان مقدمات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں بیشتر لوگوں کی تو رائے یہ ہے کہ اس ضمن میں ٹریبونل کے سامنے پیش ہونا بھی تضیع اوقات ہے۔ مقدمات سچے ہوں یا جھوٹے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم موجودہ حکومت کو انتخابات میں زبردست دھاندلیوں کے باعث قانونی حکومت تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ہم اس ملک میں نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سورج طلوع ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم ظلم کو ظلم کہنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ ہم غیر اسلامی حرکات پر چپ نہیں رہ سکتے۔ ظالم کے خلاف ہماری زبان کو خاموش کرنا ممکن ہی نہیں ہے

انسان کی عظمت کے پرستار ہیں ہم لوگ
یہ جرم اگر ہے تو خطاوار ہیں ہم لوگ

آپ کو اب نیند آرہی ہوگی کل میں شاید اسپتال جاؤں شاید اس لئے کہ جب سے جیل آیا ہوں روز ہی کہا جاتا ہے کہ

کل آپ کا جناح اسپتال میں چیک اپ کرانا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ فائل جتوئی صاحب کے پاس رکی ہوئی ہے ابھی وہاں سے نہیں نکلی۔ گویا اب ہم قیدیوں کا ایکسرے بھی جتوئی صاحب ہی کے احکامات کے تحت ہوگا ؎

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیئے؟

اب یہ معلوم ہوا کہ ٹربیونل نے جیل حکام کو ۳ دن کے اندر اندر معائنہ کرا کے رپورٹ ٹربیونل کے سامنے پیش کرنے کے احکامات صادر کئے ہیں۔ وہ تین دن بھی آج ختم ہو گئے۔ ہیں تو ٹربیونل کو کسی درخواست دینے کے حق میں نہ تھا۔ مگر شاید بھائی جان کی محبت اور شفقت نے میرے چیک اپ میں مسلسل تاخیر کو پسند نہیں کیا۔ میں تو اس پختہ یقین کو اپنا سرمایہ سمجھتا ہوں کہ اب تک میری حفاظت میرے خدا نے کی ہے اور اب بھی وہ اگر محافظ ہو تو کوئی مجھے نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ مجھے یہ افسوس ہے کہ بیماری کے باعث موجودہ جدوجہد میں اتنا حصہ نہیں لے سکا جتنا کہ میری خواہش تھی۔ مگر پھر بھی یہ سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جس قدر کے قابل سمجھا اتنا کچھ کرا لیا۔ ہنوز منزل دور ہے۔ ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور وقت نے موقعہ دیا تو رہی سہی کسر پوری کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

اب وقت بہت ہوگیا ہے آپ کو بھی نیند آرہی ہوگی اس لئے اجازت۔ ارشاد بھائی۔ اما۔ اپی۔ کنیز باجی۔ اچھی باجی، گوہر بھائی اور تمام بزرگوں اور دوستوں کو سلام

آپ کا بھتیجا

ظہور بھوپالی

ضیاء الاسلام زبیری کے نام !

وطن میں اپنے میسر ہے مجھکو بے وطنی
اسے میں روشنئ فن کہوں کہ تیرہ فنی

مگر مجھے اس ماحول ہی میں جینا ہے
ہر ایک زہر کو امرت بنا کے پینا ہے

۲۱ر اپریل ۷۷ء

مائی ڈیر ضیاء۔ ڈھیر سارے سلام قبول ہوں!

امید ہے تم بخیر ہو گے۔ تمہارا خط مجھے اس وقت ملا جب میں کراچی سینٹرل جیل
سے طبی معائنہ کے لئے جناح اسپتال آیا۔ اب واپس پہونچکر تم سے
مخاطب ہوں اور شاید مکمل طبی معائنہ کے لئے کل اسپتال میں داخل کر دیا
جاؤں، وہاں فرصت ملے یا نہ ملے اس لئے آج ہی تمہارا حساب بے باق کرنے
کا پروگرام بنایا ہے ویسے بھی ملک کی سیاسی فضاء اس قدر دھماکہ خیز
ہے کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کیا ہو جائے اس لئے سوچتا ہوں کہ فرصت
کے یہ لمحات غنیمت ہیں۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ تمہارے متعدد خطوط
جواب کے منتظر پڑے ہیں اس لئے اب ان کا جواب کینیڈا پہنچ کر
ہی دوں مگر دوستوں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ آپریشن کے زخم ابھی
ٹھیک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ انتخابات آ گئے۔ انتخابات کیا آئے کہ گویا
بہار آ گئی۔ ۵ برسوں کا دبا ہوا لاوا اُبل پڑا۔ بیماری کے باوجود بھی مجھے ایک
دن میں بعض اوقات ایک ایک درجن تقریریں کرنا پڑیں۔ تم ہر لمحے
پر یاد آتے رہے، مجھے بھی تمہاری ضرورت تھی اور دوست محمد فیضی کو
بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ تم ہوتے تو تم بھی میرے ساتھ کراچی جیل
میں یا فیضی اور شاہ فرید الحق کے ساتھ سکھر جیل میں ہوتے یا بقول
احد یوسف کہ تم نہ ہی ہوتے کیونکہ تمہاری موجودگی میں فیضی کا چانس ہارا
جاتا مگر ٹھیرو! اس پر خوشی کے مارے زیادہ پھولے نہ سماؤ۔ یہ احد یوسف
کی اپنی ذاتی رائے ہے اور اجتماعی فیصلوں میں ذاتی رائے کی کوئی خاص

اہمیت نہیں ہوتی۔ مگر تمہارے مزاج کا کیا ٹھیک ہو سکتا ہے۔ سوچ رہے ہو کہ کینیڈا کراچی یا سکھر جیل سے بہتر ہی ہے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ تم ہوتے تو لازماً جیل ہی پہنچ جاتے اس لئے کہ اپنے حاجی زاہد علی بھی تو ہیں۔ روز جلوس بھی نکال رہے ہیں اور جلسہ بھی کر رہے ہیں بیانات بھی دے رہے ہیں مگر کسی مائی کے لال کو اب تک ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں پڑی۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ گرفتاری کے وقت بھاگ جاتے ہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ گرفتاری ان کے قریب سے اگر فرار ہو جاتی ہے ویسے بھی ان کی باہر موجودگی سے کسی اور کو حوصلہ ہو یا نہ ہو مجھے تو بڑا حوصلہ ہے اگر فضا میں سفر کیا جائے تو میری جیل کی بیرک سے ان کے مکان کا دو فرلانگ سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے یوں دوری ضرور ہے مگر مجھے قربت کا ہی احساس ہے۔ حاجی صاحب ہم تک پہونچنے کے لئے اپنی سی کوشش کر چکے ہیں اور اب بھی حوصلہ نہیں ہارا ہے۔ قلندر ہیں، کبھی کبھی موج میں آتے ہیں تو یہ ہی کہہ گزرتے ہیں کہ جس دن میرے وارنٹ پر دستخط ہوئے وہ حکومت کے زوال کا آخری دن ہوگا۔ ویسے اب یہ لگتا ہے کہ شاید وہ دن اس دستخط سے پہلے ہی آ جائے اور ہاں تم بھی جیل کے بارے میں تصور میں بھی پریشان نہ ہو اسلئے کہ اب جیلیں قیدخانے نہیں جلسہ گاہیں بن گئی ہیں۔ صرف کراچی جیل میں حزب اختلاف کے کم از کم ڈیڑھ ہزار کارکن اور ۵۰ کے قریب چھوٹے بڑے قائدین موجود ہیں باہر دفعہ ۱۴۴ کی پابندی بھی ہے مگر یہاں بی کلاس کی ایک بیرک میں ۲۰ سے ۳۰ اور سی کلاس کی ایک بیرک میں دو سو سے چار سو افراد کے اجتماع پر کوئی پابندی نہیں۔ تم اگر ہوتے تو تمہیں بی کلاس تو ہم دلوا ہی دیتے اور پھر تمہیں نعرے لگانے سے لے کر تقریر کرنے، لطیفے سنانے سے لیکر چھیڑ چھاڑ کرنے کے سارے مواقع ۲۴ گھنٹے حاصل رہتے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم اپنی معرکتہ الآرا نیند کو یہاں خوب خوب پورا کر سکتے تھے۔ یہاں میرے

ساتھ جنید فاروقی اور یوسف بلوچ میرے اپنے کمرے میں ہیں، وارڈ میں جو دیگر افراد ہیں اور جن سے ۲۴ گھنٹے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہیں ان میں منور حسین اور مولانا غوث محمد شاہ جیلانی کو تم جانتے ہو۔ باقی علماء کرام ہیں ہو سکتا ہے ڈرگ کالونی کے مولانا عبدالسبحان سے واقف ہو، ان کے علاوہ بھی دس دیگر رہنمایاں اکرام ہیں اور وہاں سندھ اسمبلی میں حزب اختلاف کے کمرے کی مستقل رونقوں میں سے ایک قاری شبیر افضل بھی ہمارے ہی ساتھ ہیں۔

یہاں کراچی جیل میں متذکرہ بالا افراد کے علاوہ میر رسول بخش تالپور، چودھری ظہور الہٰی، شیخ لیاقت حسین اور جسارت والے صلاح الدین صاحبان بھی ہیں۔ رنچھوڑ لائن کے الیاس صدیقی اور اپنے علامہ شبیر احمد شرقی کو بھی بھائی لوگوں نے جیل پہونچا دیا ہے۔ بقول رسول بخش تالپور کے رونق لگی پڑی ہے۔ پیش امام صاحب بھی اس ہی جیل میں براجمان ہیں وہ سب کے بعد میں تشریف لائے شاید اسی لئے سب سے پُرجوش استقبال انھیں کا ہوا۔ اگرچہ تاخیر سے آمد کا شکوہ بھی تھا اور دیر آید درست آید کی مصداق تسکین بھی۔

یوسف بلوچ ہر نئے آنے والے کو مٹکے پانی سے بھرنے کی ہدایت کرتا ہے اور بعض سادہ لوح اسے صحیح بھی سمجھ لیتے ہیں، بے چارے مفتی محمد حسین صبح فجر کی اذان کے وقت منور حسن سے پوچھنے پہنچ گئے کہ کونسا مٹکا بھرنا ہے۔ مفتی صاحب اب سکھر جیل منتقل ہو گئے ہیں۔ مفتی محمد حسین صاحب جیسے نیک اور سیدھے لوگ موجودہ دور میں کم ہی ہوں گے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سچے عاشق رسول ہیں نعت شریف سناتے ہیں تو کیا ڈوب کر سناتے ہیں جھوم جھوم کر سناتے ہیں، پورے شوق اور لگن سے سناتے ہیں۔ جب وہ تھے تو ہماری بیرک میں اکثر عشاء کے بعد "محفلِ میلاد" سجا کرتی تھی۔ اس محفل میں ان کے علاوہ منور حسن صاحب کے سامنے بھی شمع محفل رکھی جاتی تم کو شاید معلوم نہ ہو اور ہو سکتا ہے کہ جماعت اسلامی کے بہت سے احباب

بھی اس سے واقف نہ ہوں کہ منور صاحب کی آواز بہت اچھی ہے ہم ان سے اب بھی اکثر اقبال کا کلام اور شاہنامہ اسلام ترنم سے سنتے ہیں محفل سنجیدہ ہی رہتی ہے مگر یوسف بلوچ کبھی کبھی پکے راگ کی فرمائش شروع کر دیتے ہیں۔

منور صاحب سے یہاں آکر کافی دوستی ہو گئی ہے۔ دوستی تو خیر پہلے بھی تھی یوں سمجھو بے تکلفی ہو گئی ہے۔ ہمارے درمیان کبھی کبھی اختلافی مباحث اب بھی چھڑ جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب "جنگ بندی" فوراً ہو جاتی ہے۔ پھر یہاں آکر یہ بھی انکشاف ہوا کہ منور صاحب اندر سے ابھی "نوجوان" ہی ہیں۔ جماعت اسلامی میں ذمہ دار حیثیت کی وجہ سے سنجیدگی اور رعب داب سب ظاہری باتیں ہیں اور یوں ان کا ظاہر ہم سے کتنا بھی دور ہو باطن کچھ کچھ قریب لگنے لگا ہے "کچھ کچھ" کا استعمال میں نے مصلحتاً استعمال کیا ہے۔ یوسف بلوچ کے بقول بات اس سے آگے بڑھ گئی ہے۔

اگر یہاں جیل میں کوئی شخص جیل کو پوری طرح Enjoy کر رہا ہے تو وہ یوسف بلوچ ہیں۔ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ اگر وہ کبھی سنجیدہ بھی ہوتے ہیں تو کسی کو یقین نہیں آتا۔ کافی اصرار کے بعد انہیں اپنی سنجیدگی کا پورا یقین دلانا پڑتا ہے۔ دو دن فیضی سے ان کی جملہ بازی چلتی رہی۔ پھر کچھ دن سناٹا رہا۔ منور حسن آئے تو تھوڑی رونق آئی اور جنید فاروقی آئے تو رونق دوبالا ہو گئی اب بے چارے جنید فاروقی ہیں اور یوسف بلوچ کے تابڑ توڑ حملے۔ کبھی کبھی جنید کی طرف سے بھی پوائنٹ ہو ہی جاتا ہے۔ بہر طور مختصراً محفل بہت خوشگوار ہے تم ہوتے تو یوسف بلوچ سے تمہاری برابر کی ٹکر رہتی فی الحال تو زیادہ تر ون وے ٹریفک ہی ہے۔ تمہاری تفریح طبع کے

لئے ایک لطیفہ یہ بھی ہے جنید فاروقی پر الزام یہ ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے لئے مالیات فراہم کرتے رہتے ہیں اور سی۔ آئی۔ اے نے انھیں ایک ہفتہ اپنی تحویل میں رکھا اور اسی موضوع پر ان سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ انھیں ممتاز ادیب و صنعتکار عابد زبیری کے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے جن پر این۔ ڈی۔ پی یعنی مزاری صاحب کو مالیات فراہم کرنے کا الزام ہے۔ پھر تم نے زور کا قہقہہ لگایا لگتا ہے تمہاری یہ عادت کینیڈا میں بھی نہیں چھوٹ سکی ہے۔ سی۔ آئی۔ اے والوں نے جنید فاروقی پر کوئی بہت زیادہ مضحکہ خیز الزام تو نہیں لگایا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ رپورٹ میں بات الٹی ہو گئی ہو۔

کراچی میں تمہاری یہ عادت تھی کہ تم اپنے جاننے والوں کے ناموں پر سیاسی نعرے بنایا کرتے تھے اس لئے تمہیں اس سے ضرور دلچسپی ہوگی کہ تمہارے جاننے والوں کے انتخابات میں کیا کیا نعرے لگے مگر کچھ باتیں تو میں باقی رکھنا چاہتا ہوں ورنہ ملاقات پر کیا سنا سکوں گا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ۵ سال کی قربت کے باوجود تم "مرد مجاہد حاجی زاہد" کا نعرہ نہ دے سکے جو کورنگی والوں نے دے دیا اور خوب دیا۔ اور شاید اسی لئے مرد مجاہد پر اب تک کوئی ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کر پایا ہے۔

جب تم واپس آؤ گے تو سب سے زیادہ تبدیلی دوست محمد فیضی میں پاؤ گے۔ دوست محمد کو لانڈھی سے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔ اور اگر انتخاب کا بائیکاٹ نہ ہوتا تو شاید اسے کراچی میں سب سے زیادہ ووٹوں کی لیڈ حاصل ہوتی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ سیاسی محفلوں میں شرمانے اور جھینپنے والا فیضی نہ صرف انتخابی

مہم کے جلسوں کا مقبول مقرر ثابت ہوا ہے بلکہ جو عام طور پر جھگڑوں سے دور رہنا کا عادی تھا۔ ہنگامہ خیز جلوسوں میں بھی پیش پیش رہا ہے اب بڑے حوصلے کے ساتھ جیل گیا ہے۔

مجھے ۲۵ مارچ کو رات ۵ بجے گرفتار کر کے جب باہر نکلے تو میں نے پوچھا کہاں چلنا ہے جواب دیا گیا۔ تھانہ فیروز آباد۔ مگر گاڑی پولیس کی ہدایت پر واپس خالد بن ولید روڈ کی طرف جانے لگی تو میں نے پوچھا۔ کیا اور کسی کو بھی لینا ہے۔ معلوم ہوا۔ دوست محمد فیضی بھی ہمسفر ہوں گے۔ فیضی کے گھر پہونچے تو فیضی صاحب اپنے گھر کے سامنے پولیس والوں کے جلو میں ہمارے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ ہنستے کھیلتے تھانہ پہونچے اور وہاں سے کراچی جیل پہونچا دیا گیا۔ جہاں شاہ فرید الحق کو دیکھ کر ہم اور زیادہ باغ باغ ہو گئے اور پھر حضرت قبلہ نورانی صاحب بھی جب لائے گئے تو ان کی وجہ سے ہم کو گرفتاری اور جیل کا احساس بھی جاتا رہا۔ یہ حضرات دو دن کراچی جیل میں رہے اور پھر سکھر جیل بھیج دیئے گئے۔ مجھے بھی سکھر جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر میری علالت کے باعث سفر مناسب نہ سمجھا گیا اور ڈاکٹروں نے میرے اصرار اور احتجاج کے باوجود مجھے کراچی جیل ہی میں روک دیا

فیضی کی گرفتاری سے اندازہ تھا کہ کراچی سے درجنوں افراد گرفتار کئے ہوں گے۔ مگر دوسرے دن خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ کراچی سے امتناعی نظر بندی کے احکامات کے تحت اس رات کو سردار شیرباز مزاری، مولانا شاہ احمد نورانی، شاہ فرید الحق، دوست محمد فیضی، اور یہ خاکسار ہی گرفتار ہوئے یا ہو سکے اور یوں تمہارا دوست "دوست محمد" قومی رہنماؤں کی صف میں آگیا ہے۔ سنا ہے سکھر جیل میں سندھی اور

عربی سیکھ رہا ہے اور دروغ برگردن راوی "مونچھ ہیں ہے۔ دوست محمد فیضی کو یہ سوچ کر ٹکٹ دیا گیا تھا کہ وہ ایک اچھا پارلیمنٹرین ثابت ہوگا اس وقت حالات کے اس قدر بگڑنے کا اندازہ شاید کسی کو بھی نہ ہو فیضی اور ان کے گھر والے خاصی مشکل سے اس میدان میں کودنے پر تیار ہوئے تھے مگر اب بقول اہالیان لانڈھی "لانڈھی کی ماؤں کے بیٹے اور بہنوں کے بھیا" فیضی نے پوری طرح خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال لیا ہے اور قومی تحریک میں اسی ہی جذبے کے ساتھ شریک ہے جس جذبہ کے ساتھ کہ جمیعت العلماء پاکستان کا کوئی بھی مخلص ترین کارکن، خادم یا رہنما مصروف عمل ہوسکتا ہے

تم یہاں کے حالات جاننے کے لئے بے چین ہو گے تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ پاکستانی ملک کے حالات سے پریشان ہیں۔ خبریں تو تم کو ساری ملتی ہی رہتی ہوں گی اب تک موجودہ تحریک میں دو سو کے قریب افراد شہادت پا چکے ہیں۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ ممکن ہی نہیں۔ ملک بھر میں ۲۵ ہزار افراد کے لگ بھگ کارکن قائدین اور عوام جیلوں میں ہیں۔ موجودہ تحریک پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی پر جوش اور منظم تحریک ہے۔ شاید ہی کوئی قصبہ ہو جہاں گرفتاریاں پیش نہیں ہو رہی ہوں۔ احتجاجی جلوس مسلسل نکل رہے ہیں اور ہر شہر اور ہر قصبہ میں نکل رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جذبات میں ابال آگیا ہے یا پھر بند ٹوٹنے سے سیلاب آگیا ہے۔ گولیاں چل رہی ہیں مگر جلوس کے شرکاء آگے بڑھ رہے ہیں۔ وکلاء علماء، طلباء، مزدور، کسان اور خواتین سب اپنی اپنی ایکشن کمیٹیاں بنا کر میدان میں ہیں۔ پاکستان کی خبریں اس وقت بین الاقوامی خبروں کا موضوع بنی ہوئی ہیں اس لئے سب ہی خبریں

تم کو معلوم ہوتی رہتی ہوں گی۔ لیکن میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تحریک کی شدت اور پھیلاؤ کی نوعیت کا صحیح تصور تمہارے لئے ممکن نہ ہوگا اور نہ ہم میں سے کوئی شخص ایک ماہ قبل تک اس بارے میں سوچ بھی سکتا تھا۔ اور ساری باتیں کہاں تک لکھوں۔ ایک سانحہ ایسا ہے جس کی اطلاع ممکن ہے تمہیں نہ ملی ہو۔ رضوان صدیقی کا چھوٹا بھائی شجاع الحق صدیقی عرف چمن جسے تم بھی اچھی طرح جانتے ہو گے شہادت کے درجہ پر فائز ہوگیا۔ کیا تم اس خوبصورت نوجوان کی موت کا تصور کر سکتے ہو۔ جسے تم نے میرے اور ہلال کے ساتھ گذشتہ سال لندن رخصت کیا تھا۔ یہ پچھلے دنوں لندن سے کراچی اپنی شادی کے لئے آیا تھا۔ ۲۶ فروری کو اس کی شادی ہیں میں بھی شریک تھا۔ ہنستے مسکراتے چمن نے مجھے انتخاب کے بعد لندن آنے کی دعوت دی تھی اور میں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ ضیاء زبیری کے پاس کینیڈا ساتھ چلیں گے۔ ۲۰ یا ۲۱ مارچ کو چمن حیدر آباد میں اپنے گھر میں کھانا کھا کر ہاتھ دھو رہا تھا۔ مرکزی دروازہ کھلا تھا۔ شاہی بازار کے کونے سے کسی شقی القلب سپاہی کی گولی آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سدا بہار چمن کو خون میں نہلا گئی۔ مجھے جب اطلاع ملی تو چمن منوں مٹی تلے دبایا جا چکا تھا اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ یہ کیسے ہوگیا۔ میں تو رضوان سے تعزیت کے دو بول بھی نہ کہہ سکا۔ چمن پر ہی کیا موقوف، زیادہ تر شہداء نوعمر/نوجوان ہیں۔ ۸ اور ۱۰ سال کے بچے بھی گولیوں کا نشانہ بنے ہیں۔ یہ خون رائیگاں نہیں جا سکتا۔ اس لہو کے ہر قطرے نے پوری قوم کے اندر عزم و حوصلے کے ہزاروں چراغ روشن کر دیئے ہیں۔ کینیڈا میں موجود پاکستانیوں سے کہو اگر تم کچھ نہیں کر سکتے

ہو تو ان شہداء کے لئے ایصال ثواب کے لئے محافل ہی منعقد کر لو گولی سے زیادہ انتقامی کاروائی اور کیا ہو سکتی ہے ۔ چمن تو کسی سیاسی جماعت کا رکن نہ تھا اس نے کسی سیاسی جلسہ میں یا جلوس میں کبھی شرکت نہیں کی ۔ اس کا کوئی بیان اخبار میں نہیں چھپا ۔ پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس بے قابو گولی سے تمہارے اور ہمارے گھر محفوظ رہ سکیں گے تم وطن سے دور بے وطن ہو مگر یہاں تو ہر فرد اپنے آپ کو بے وطن محسوس کر رہا ہے ؎

وطن میں اپنے میسر ہے مجھ کو بے وطنی
اسے میں روشنیٔ فن کہوں کہ تیرہ فنی

ضیاء! میں تھوڑا سا جذباتی ہو گیا ہوں ۔ مگر اس وقت تو پوری قوم جذباتی ہے ۔ جذبات کا یہ دھارا کسی کے روکے سے اب رکتا نظر نہیں آتا ۔ کون جانے کل کیا ہو ۔ پریشانی صرف ذہن کی ہے ۔ قلب مطمئن ہے ۔ ضمیر کو تسکین ہے ۔ ہم نے نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کے لئے قربانی دینے کا عہد کیا تھا خدا کا شکر ہے اب تک ہمارے پایۂ ثبات میں لغزش نہیں آسکی ہے لالچ بھی دیئے گئے ۔ دھمکیاں بھی ملیں ۔ یقین کی دولت سے مالا مال ضمیر کبھی بکاؤ مال نہیں بنا کرتے الحمدللہ پوری قوم کی بہت بھاری اکثریت آج اس ہی جذبہ سے سرشار ہے اور کسی طور بھی بکاؤ مال بننے کے لئے تیار نہیں ۔ مصلحتوں کا سہارا لے کر بہت سے لوگ کمزوری کا مظاہرہ کر رہے ہیں ان میں کچھ اپنے ہیں اور غیر بھی لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے ۔ ورنہ ہر طرف نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کی تحریک کا زور ہے اور لوگ پروانہ وار جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے امنڈ پڑے ہیں ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ۔۔ !

گفتگو بہت زیادہ طویل ہو گئی ہے اس لئے مختصراً آخر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ دیارِ غیر میں تمہیں جہاں مشکلات درپیش ہیں وہاں تمہارے کردار، گفتار اور شخصیت کی تعمیر کے بہتر امکانات موجود ہیں۔ تمہارے جیسے مزاج کا آدمی وہاں کی معاشرت اور سوسائٹی سے اپنے آپ کو منفرد اور ممتاز رکھنے کے لئے زیادہ بہتر جدوجہد کی پوزیشن میں ہے۔ اس لئے تمہیں وہاں کے ماحول سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ خلوص کی اہمیت کا احساس وہاں ہوتا ہے جہاں اخلاص عنقا ہو۔ اسی طرح نیکی کی اہمیت کا احساس بھی وہاں زیادہ بہتر ممکن ہے جہاں چاروں طرف برائیاں پھیلی ہوئی ہوں ہم سب تمہارے لئے دعاگو ہیں خدا تمہیں اپنے ارادوں میں کامیاب کرے اور جب تم وطن واپس آؤ تو ہمارے ہی لئے نہیں اس ملک کے لئے بھی قیمتی سرمایہ ثابت ہو سکو !

تمہارا
ظہور بھائی

مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی

کے برادر بزرگ

جناب شاہ محمد جیلانی صدیقی کے نام

" انسان کی عجیب نفسیات ہے کبھی تو موت سے اس قدر ڈرتا ہے کہ ملیریا سے بھی خائف ہو کر گھبرا جاتا ہے اور کبھی بے اختیار ہو کر خود ہی موت کے منہ میں کود پڑتا ہے بات صرف جذبے کی ہے۔ یہ جذبہ ہی ہے جو انسانوں کو بے خوف و نڈر بنا دیتا ہے۔

۲۰ر اپریل ۷۷ء

اسپیشل وارڈ جناح ہسپتال کراچی

محترم جیلانی بھائی ۔ سلام عقیدت قبول کیجئے ۔

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے اور ملکی حالات سے پوری طرح باخبر بھی آج اخبار میں ہائڈ پارک میں پاکستان کے حالیہ تحریک کے شہداء کی غائبانہ نماز جنازہ کی تصویر نظر سے گذری تو بے ساختہ آپ یاد آ گئے ۔ مجھے خیال کیا بلکہ یقین ہے کہ نماز جنازہ میں آپ بھی شریک ہوں گے ۔ تصویر میں ڈھونڈنے کی کوشش اس لئے کامیاب نہ ہو سکی کہ بس وہ ایک اخباری تصویر ہی تھی جس میں چہرے تلاش کرنے کے لئے محدب عدسے کی ضرورت تھی جو ظاہر ہے کہ ایک نظر بند کی دسترس میں کہاں ہو سکتا ہے ۔ میں کوئی ایک ہفتہ سے جناح ہسپتال زیر حراست مریض کی حیثیت سے زیر علاج ہوں ۔ کراچی جیل میں تھا تو وہیں پاکستانی سفارت خانے پر مظاہرے کی خبر بی ۔ بی ۔ سی پر سُنی اور فوراً احساس ہو گیا کہ جیلانی بھائی بھی ہم سے ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود ہماری ہی طرح سرگرم ہو چکے ہیں ۔ ہسپتال آنے کا مقصد محض چیک اَپ تھا کیونکہ آپریشن کے بعد ابھی تک میں نارمل نہیں ہو سکا ہوں ۔ اور جنوری سے کسی قسم کا چیک اَپ بھی نہیں ہو سکا ۔ پہلے الیکشن کی مصروفیات اور تحریک کے معاملات اب جب جیل پہنچے تو کچھ فرصت ملی ۔ کمر میں الٹی طرف درد کی تکلیف محسوس ہوئی اور ڈاکٹر سے چیک اَپ ضروری سمجھا تو جمعیت کے ساتھیوں نے ٹریبونل سے احکامات جاری کرائے اور یوں ہسپتال لے آیا گیا ۔ خیال تھا کہ جلد واپس اپنے ساتھیوں کے پاس چلا جاؤں گا ۔ مگر ابھی تک

درد کی صحیح وجہ تشخیص نہیں ہو سکی ہے۔ آپریشن کے حصّوں کا ایکسرے ٹھیک ہے مگر خون کی رپورٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔ سو جیل کی محفلوں اور ساتھیوں کی کوشش کے باوجود ابھی ہسپتال ہی میں رہنے پر مجبور ہوں۔ مجھے ۲۵ مارچ کی شب قبلہ مولانا شاہ احمد نورانی۔ سردار شیر باز مزاری۔ پروفیسر شاہ فرید الحق اور دوست محمد فیضی کے ساتھ کراچی سے گرفتار کیا گیا تھا۔ میرے علاوہ باقی حضرات سکھر جیل لے جائے گئے تھے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی کو واپس کراچی جیل لایا گیا ہے اور یوں واپسی کی میری خواہش بھی دوچند ہو گئی ہے۔

آپ سے ملاقات ہوئے قریب قریب ایک سال ہو گیا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ گذشتہ سال میں ۱۴ اپریل کو لندن پہنچا تھا اور وہاں سے ۵ مئی کو عمرے کے لئے سعودی عرب روانہ ہوا تھا۔ اگرچہ میرا قیام مختصر رہا مگر آپ کی محبت اور شفقت کے نقوش اس قدر گہرے ہیں کہ آپ اکثر یاد آتے رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ بریڈفورڈ کا یادگار سفر، کنوائے ہال کا جلسہ، سینٹ البانز کی دعوت، مصطفےٰ بھائی کے یہاں کی محفلیں۔ یہ سب لگتا ہے گویا کل کی سی باتیں ہیں۔ آپ کی دل سوز گفتگو، پاکستان کے معاملات کا ذکر کرتے ہوئے آپ کا بار بار آزردہ ہو جانا اور آپ کی جذباتی کیفیت۔ یہ سب یاد آتا ہے تو میں اس خیال میں ڈوب جاتا ہوں کہ ان دنوں آپ پر کیا گذر رہی ہو گی

محاذ سالمیت پاکستان کی سرگرمیوں اور بنگلہ دیش نامنظور کی تاریخی جدوجہد نے آپ کو معاشی طور پر تباہ کر دیا تھا۔ اب کسی حد تک آپ سنبھلے تو موجودہ تحریک کے پرچم تلے سرگرم ہو گئے۔ مجھے احساس ہے کہ اس میں بھی آپ اپنی پوری جذباتی انتہا پسندی کے ساتھ

منہمک ہوں گے مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ اس ضمن میں آپ سے کچھ عرض کرنا بے سود ہوگا۔ ویسے بھی ان دنوں پوری پاکستانی قوم کا یہی حال ہے اور پھر آپ تو تحریک میں خود کو گم کر دینے کے اصول کے قائل ہیں اس وقت کسی سے کچھ کہنا ویسے بھی ممکن نہیں ہے۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ ہمارے دلوں کی دھڑکن اور سوچوں کا دھارا یکساں ہے۔ ہر محب وطن پاکستانی ایک ہی لگن اور جذبہ کا شکار ہے۔ اور اسی لئے آپ کے جذبات و احساسات کا بھی میں باآسانی اندازہ کرسکتا ہوں۔ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ الفاظ میں ان کا بیان ممکن نہیں۔ آپ لوگ تو کسی حد تک حالات کا ادراک کر سکتے ہیں۔ باہر کی دنیا پاکستان کے حالات سے پاکستانیوں سے زیادہ واقف ہے۔ ہم پاکستانی بھی اپنے ملک کے بارے میں جاننے کے لئے باہر ہی کے ریڈیو سننے پر مجبور ہیں۔

ہم لوگ جو ان دنوں پسِ دیوارِ زنداں ہیں۔ دراصل ڈیفنس آف پاکستان رولز کے مجرم ہیں۔ گویا ہم سے پاکستان کی سلامتی خطرے میں ہے۔ اور ملک کی سلامتی کے ان دشمنوں کی تعداد ۲۵ ہزار سے کچھ زائد ہی ہوگی۔ اور یوں پاکستانی جیلوں میں پاکستان دشمنوں کے لئے مزید گنجائش نہیں رہی ہے۔ وطن دشمنوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور محب وطن لوگوں کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے۔ حالات کی اس ستم ظریفی پر میں اس کے سوا کیا تبصرہ کرسکتا ہوں ؎

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے جشنِ بہار
ہمیں پہ نظمِ گلستان کو اعتبار نہیں !!

یا پھر ؎

نیرنگیٔ سیاست دوران تو دیکھئے
منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ذکر میری علالت کا ہو رہا تھا۔ برطانیہ اور سعودی عرب سے واپسی کے بعد جون اور جولائی اسمبلی کے اجلاس کی نذر ہو گئے اور ۲۴ر اگست کو میں اچانک کمر کے درد کی تکلیف کے سبب اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو کر ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ میرے معالج ڈاکٹر سلیمان خان انسانیت دوستی و ہمدردی کے ساتھ ساتھ فن کے اعتبار سے بھی بہترین سرجن ہیں وہ سنہ ۱۹۶۹ء سے میرے معالج ہیں۔

علاج و معالجہ کا مجھے طویل تجربہ حاصل ہے اور کراچی کے تین بہترین orthopaedic سرجنوں۔ سرجن قاضی۔ سرجن رحیم اور سرجن سلیمان اور متعدد دیگر ڈاکٹروں سے میرا واسطہ پڑا ہے۔ ۶ ماہ کے قریب سنہ ۱۹۶۶ء میں میں ڈاکٹر سمکاک کے زیر علاج بھی رہا ہوں۔ جس کے بارے میں شہرت یہ تھی کہ وہ ہڈیوں کا بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے بھی میری ریڑھ کی ہڈی کا ایک آپریشن ان دنوں کیا تھا۔ سرجن رحیم اور سرجن قاضی بھی ہمارے ملک کے ماہرین فن میں سے ہیں۔ سرجن قاضی کے زیر علاج میں سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۵۲ء تک رہا ہوں۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں سرجن رام نرائن حمیدیہ ہسپتال بھوپال مدھیہ پردیش بھارت اور پھر سنہ ۶۱-۱۹۵۹ء میں سرجن رحیم نے میرا علاج کیا۔

سنہ ۶۲-۱۹۶۱ء میں سیونتھ ڈے ایڈونٹیسٹ ہسپتال کراچی کے سرجن ولکنسن کے زیر علاج رہا۔ ان کی شخصیت نے بھی مجھے کافی متاثر کیا۔ وہ امریکہ واپس چلے گئے تو گویا اس ہسپتال سے میرا تعلق بھی

ختم ہوگیا۔ کراچی میں ڈاکٹر سلیمان احمد خاں کے علاوہ مجھے جتنے تلخ تجربات ہوئے ہیں ان پر پردہ پڑا رہنا ہی بہتر ہے۔ لیکن ان طویل اور صبر آزما تجربات کی روشنی میں اگر میں ڈاکٹر سلیمان احمد خاں کا معترف ہوں تو یہ کوئی سرسری سی بات نہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بعض ماہر ڈاکٹر بھی مریض کے مرض سے زیادہ اس کی جیب پر نظر رکھتے ہیں۔ مگر سلیمان احمد خاں کی موجودگی اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ کوئی کلیہ نہیں۔ اس ملک میں ماہر ڈاکٹروں میں بھی انسانیت دوست اور غریب پرور موجود ہیں۔

ڈاکٹر سلیمان احمد خان کی تشخیص یہ تھی کہ میری ریڑھ کی ہڈی کے گریئے کمزور پڑ چکے ہیں اور وزن نہیں سہار پاتے اس لئے FUSION کے آپریشن کے ذریعہ ہڈیوں کا جوڑ لگا کر یعنی پیوند کاری کر کے ہی صورت حال بہتر ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۱ء میں جب میں تقریباً ۴ سال کا تھا گر جانے کی وجہ سے میری ریڑھ کی ہڈی کے دو گریوں میں کریک آگیا تھا اور جب سے میں نے ہر طرح کے ڈاکٹروں کا اور قسم قسم کے ہسپتالوں کا مزا چکھا ہے۔ حمیدیہ ہسپتال بھوپال، سیونتھ ڈے ہسپتال کراچی، ہمکاک کلینک کراچی اور جناح ہسپتال کراچی میں مہینوں داخل رہا ہوں۔ سول اور جناح ہسپتالوں کی طویل لائنوں میں اپنے والد کے ہاتھوں پر میں نے کئی کئی گھنٹے گذارے ہیں۔ اس ضمن میں مجھے جن تلخ تجربات سے دوچار ہونا پڑا ہے وہ ایک الگ اور طویل کہانی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میرے حوصلہ مند ماں باپ نے مجھے کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ میری حالت کیسی ہی کیوں نہ رہی ہو میرا کوئی تعلیمی سال ضائع نہیں ہوا۔ طالب علم مقرر کی حیثیت سے

زائد از نصاب سرگرمیوں میں بھی دل کھول کر حصہ لیا۔ صحافی کی حیثیت سے ہم جو رپورٹنگ میں بڑھ چڑھ کر کام کیا اور اب سیاست کے میدان میں ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے نارمل آدمیوں سے زیادہ محنت کی ہے۔ ہمارے محترم بزرگ چچا عباسی جو بہت پرانے صحافی اور comments کراچی کے ایڈیٹر ہیں اکثر کہا کرتے ہیں (شاید مذاق کرتے ہوں) کہ میں اگر کسی یورپی ملک میں ہوتا تو اب تک سینکڑوں فیچرز کا موضوع بن چکا ہوتا۔ خیر یہ ان کی ہمّت افزائی ہے۔ میں تو آپ سے یہ سب کچھ اس لیئے عرض کر رہا ہوں کہ انسان اگر حالات کے آگے ہتھیار ڈال دے تو شاید زندگی میں کچھ بھی نہ کر سکے اس لئے کہ بقول حضرت باسط بھوپالی مرحوم ؎

جو تھک کے جہاں خود بیٹھ گیا منزل ہے وہی اُسکی باسط
یعنی کوئی صورت منزل کی جُز ترکِ منازل کوئی نہیں

ورنہ ؎

منزل دارُو رسن لوح و قلم سے آگے
ہر جگہ ہم ہی ملیں گے تمہیں ہم سے آگے

ہاں تو جیلانی بھائی۔ ڈاکٹر سلیمان صاحب مجھ پر بہت زیادہ شفقت فرماتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۹ء سے بڑا ہی تندہی اور خصوصی توجہ سے میرا علاج کیا ہے۔ حالیہ آپریشن کی پیش گوئی وہ بہت پہلے کر چکے تھے اور لندن میں چیک اپ کے دوران نیشنل آرتھوپیڈک ہسپتال کے ڈاکٹر کیمپ نے بھی یہی کچھ مشورہ دیا تھا۔ مگر مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی ضروری ہو جائے گا۔ سلیمان صاحب کا کہنا تھا کہ ایسے میں بہت سے آپریشن کر چکا ہوں۔ یہ آپریشن طویل بھی ہے اور سیریس بھی اور یہاں پاکستان

میں آپریشن کے بعد دیکھ بھال اور احتیاط کا مرحلہ تسلی بخش نہیں ہو پائے گا۔ اس لئے انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس آپریشن کے لئے ہانگ کانگ چلا جاؤں۔ انھوں نے اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

دوست احباب سرمایہ کی کمی کو محسوس کر کے پیسے لے کر حاضر ہو گئے۔ کچھ "اِدھر اُدھر" کے دوستوں یا رقیبان سیاست کو بھی مدد کا خیال آیا اور جہاں میں چاہوں مجھے بھیج کر علاج کرانے کی پیش کش کی۔ مگر میں پہلے ہی دن سے یہ طے کر چکا تھا کہ کتنا ہی بڑا خطرہ کیوں نہ ہو آپریشن ضرور کراؤں گا مگر صرف اور صرف ڈاکٹر سلیمان سے اور پاکستان ہی میں کراؤں گا اور آخر تک میں اس پر قائم رہا۔ میرے احباب اور اعزاء بالآخر مجھ کو خدا کے سپرد کر کے میرے اصرار اور فیصلہ پر راضی ہو ہی گئے۔

میرے اس آپریشن میں میری عام کنڈیشن کے باعث مختلف پیچیدگیاں محسوس کی جاتی رہیں۔ بے ہوش کرنے کے ماہر AnesThesist ڈاکٹر عطار نے بے ہوش کرنے کا خطرہ مول نہ لینے کی ہدایت کی اور تقریباً ½۱ ماہ تک وہ سرجن سلیمان کو روکتے رہے مگر چار و ناچار میرا عزم سب پر حاوی آگیا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو چار گھنٹے طویل آپریشن ہوا۔ بزرگوں کی دعاؤں، خدا کے فضل و کرم اور سبز گنبد والے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتوں نے اس مرحلہ سے بھی کامیابی سے گذار دیا۔ آپریشن کے بعد کی دیکھ بھال کا بیڑہ جناح ہسپتال میں انتہائی توجہ کے وارڈ کی انچارج ڈاکٹر حمیدہ نے اٹھایا اور جس قدر امکانی توجہ ہو سکتی تھی وہ انھوں نے دی۔ مختصر یہ کہ ابھی آپریشن کے بعد کے مرحلہ سے

گذر رہا تھا کہ انتخابات کا اعلان ہو گیا اور جب انتخابی مہم شروع ہوئی تو میں سہارے ہی سے سہی مگر پوری طرح میدان میں تھا۔ فی الوقت ہسپتال میں ہوں اور رقیبانِ سیاست کے ہاتھوں نظربند بھی لیکن میرا یقین ہے کہ آپ جیسے بزرگوں کی دعاؤں کے سہارے اس مرحلہ سے بھی سرخ روئی کے ساتھ گذر ہی جاؤں گا۔ انشاءاللہ العزیز! میرے لئے پریشانی کا ویسے بھی کوئی جواز نہیں۔ موجودہ جدوجہد میں اس وقت دو سو سے زیادہ ماؤں کے جگرگوشے شہادت کی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ ہزاروں افراد قید ہیں اور واقعتاً قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ لاتعداد زخمی بستروں پر پڑے ہیں۔ ان حالات میں میرا ایثار تو محض انگلیاں کٹا کر شہیدوں میں نام لکھانے کے مترادف ہے۔ موجودہ تحریک میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے کیا ہے مگر بہت کچھ نہ کرنے کا غم ہے۔ اس وقت جب میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں لاہور۔ لائلپور۔ حیدرآباد۔ کراچی کرفیو کی زد میں ہیں۔ خون مسلسل بہہ رہا ہے۔ گولیاں چل رہی ہیں اور اپنوں ہی کے ہاتھوں زیادہ تر نوجوانوں کے سینے چھلنی ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ عزم ابھی تک جوان ہے ؎

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے!

ایک طرف تو یہ حال ہے اور دوسری طرف ہمارے "عوامی" وزیر اعظم کا کہنا ہے سب ٹھیک ہے۔ حزب اختلاف کو مذاکرات پر آمادہ کرنے کے لئے نت نئے حربے اختیار کئے جا رہے ہیں دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں۔ مگر

اپوزیشن بات چیت کس موضوع پر کرے؟ وہ انتخابات میں دھاندلیاں تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں بلکہ دھاندلیوں کے سرے سے منکر ہیں۔ اگرچہ الیکشن کمیشن نے بزعمِ خود جن انتخابات کو اب تک کالعدم قرار دیا ہے ان میں ہزارہا بوگس ووٹوں کے وجود کا اعتراف کیا گیا ہے۔

یہ صورت حال پنجاب کے ہر حلقہ میں ہے۔ ۴۰ کے قریب حلقوں میں تو سنگین بدعنوانیوں کا اعتراف الیکشن کمیشن کو بھی کرنا پڑا ہے۔ پھر بھی یہی ضد ہے کہ "میں نہ مانوں" پھر اب تو مسئلہ یہ ہے کہ قوم بے بنیاد مذاکرات نہیں چاہتی جناب رفیق باجوہ کا جرم یہی تو تھا کہ بھٹو نے بلوایا اور وہ چلے گئے۔ حالانکہ اس وقت فضاء میں اتنی کشیدگی اور اشتعال نہ تھا۔ باجوہ صاحب نے قرآن پاک کی قسم کھا کر اعلان کیا ہے کہ میں نے کوئی سودے بازی نہیں کی۔ میں قوم کے مطالبات کے ساتھ ہوں۔ ان سے محض ایک سیاسی غلطی سرزد ہوئی جسے ان کے مشیروں یا موقع کا انتظار کرنے والوں نے خفیہ رکھنے کا مشورہ دے کر سنگین بنا دیا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ناتجربہ کاری اور غلط اعتماد میں مارے گئے۔ لیکن اس سے قوم کے اس رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے کہ قوم کے لئے جناب بھٹو کی ذات نفرت کا کتنا بڑا نشان بن چکی ہے اور ان سے ملاقات اتنا سنگین جرم بن چکا ہے کہ وہ یعنی "باجوہ" بھی عوامی نفرت کے اس طوفان میں بہہ گئے۔ وہ باجوہ جن کے سر پاکستان قومی اتحاد کے قیام کا سہرا ہے۔ جو انتخابی مہم کے دوران اپنی مؤثر تقریروں کے سہارے ملک کے مقبول ترین لیڈر بن گئے تھے۔ قومی اتحاد اور جمعیت سے ان کی سبکدوشی

دراصل عوام کے اسی شدید رجحان کا آئینہ دار ہے ۔ پھر اس رجحان کی عکاسی دوسری بار اس وقت ہوئی جب مولانا مودودی نے صورتِ حال کی اصلاح کے لیئے ایک بیان جاری کیا جس میں دوسرے تمام مطالبات کی تائید تھی مگر بھٹو کے استعفے یا اسمبلی توڑنے کا ذکر نہ تھا ۔ مولانا نے وہ بیان یقیناً تفصیلی سوچ و بچار کے بعد مکمل احساسِ ذمہ داری کے ساتھ دیا ہوگا لیکن عوام کی کیفیت تو یہ ہے کہ وہ جناب بھٹو کے استعفے سے کم کسی اور بات کو سننا ہی نہیں چاہتے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی جیسے بزرگ سیاستدان کو بھی اس بیان سے رجوع کرنا پڑا ۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں نے مذکورہ بیان اپنی ذاتی حیثیت میں دیا تھا اور اب ان مطالبات پر عمل درآمد کا وقت بھی گذر گیا ۔ جماعت اسلامی نے اپنے بانی کے اس بیان سے برأت کا اظہار کیا اور یوں عوام کا رجحان کھل کر سامنے آگیا ۔

اس وقت قومی اتحاد کا کوئی رہنما جناب بھٹو سے ذاتی اور غیر رسمی ملاقات کی پوزیشن میں نہیں ہے ۔ ہر ایک کے پاس جناب بھٹو خود جا کر ملنے کے لیئے تیار ہیں ۔ مگر مولانا مودودی کے سوا کسی سے ملنے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔

پیر صاحب پگاڑو سے فون پر بات کی اور انھوں نے ملاقات سے معذوری کا اظہار کیا ۔ مفتی محمود صاحب اور سردار مزاری صاحب نے ان کے بھیجے ہوئے نمائندے تک سے ملنے سے انکار کر دیا ۔ ایئر مارشل اصغر خان اور مولانا نورانی صاحبان سے ملنے کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا ۔ مولانا مودودی کے بھی گھر جا کر ملاقات کی تو مولانا موصوف نے فوراً اخبارات کو یہ وضاحت جاری کی کہ

میں نے انھیں مستعفیٰ اور عبوری حکومت کے تحت انتخابات کا دوٹوک مشورہ دیا ہے۔ قوم اس قدر آگے بڑھ چکی ہے کہ اس نے بھٹو صاحب کی جانب سے شراب، جوئے اور نائٹ کلبوں پر پابندی، تنخواہوں میں اضافے اور زمینوں کے مالکانہ حقوق دینے کے اعلانات کا کوئی نوٹس تک نہیں لیا۔ جب کہ عام حالات میں یہ اقدامات پُرجوش عوامی حمایت کی بنیاد بن سکتے تھے۔ لوگوں کے جذبات کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ لوگ ریل کو روکنے کے لئے آگے لیٹ کر کٹ گئے۔ گولیاں چلتی ہیں تو وہ سینے کھول کر آگے آجاتے ہیں۔ ان حالات میں صرف تین شہروں میں مارشل لاء لگا کر نئی دھمکیوں کے ساتھ جناب بھٹو میدان میں آئے ہیں۔ مگر کیا یہ دھمکیاں اور تشدد اشتعال کی آگ کو ٹھنڈا کر سکے گا۔ فی الوقت حالات ایسے ہیں کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔

عوام جانیں دے رہے ہیں۔ معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ ملکی وقار خاک میں مل چکا ہے۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ ہر لمحہ قومی نقصان میں اضافہ کا سبب بن رہا ہے۔ کیا آنے والے وقت میں ہم ان نقصانات کی تلافی کر سکیں گے۔ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ بھٹو صاحب نے اسلام آباد میں قومی اسمبلی اور سینٹ کا اجلاس طلب کر لیا ہے۔ وہ ہر بات کو معمول کے مطابق ظاہر کرنے کا ڈرامہ کر رہے ہیں۔ مگر یہ ان کی غلط فہمی یا خوش فہمی ہی ہو سکتی ہے۔ کاش کسی طرح ان کی آنکھیں کھل سکیں۔ کاش قوم کے جذبات اور موجودہ بحران کی سنگینی کا وہ احساس کر سکیں۔

گذشتہ شب آپ کو یہیں تک خط لکھ پایا تھا کہ نیند آگئی۔

آج مغرب کی نماز کے بعد پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اطلاع ملی ہے کہ لیاقت آباد میں کرفیو کی خلاف ورزی پر نہتے لوگوں پر بہادر جوانوں نے اسٹین گن سے گولیاں برسائی ہیں۔ شہادت پانیوالوں کی کم از کم تعداد ۵ ابتائی گئی ہے۔ مگر صحیح تعداد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ریڈیو پاکستان ظاہر ہے کہ سرکاری پریس نوٹ ہی دے گا۔ اب خون اتنا بہہ چکا ہے کہ ہر محب وطن کا دل بھی خون خون ہو رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ لہو بہتا دیکھ کر ہی تسکین محسوس کر رہے ہوں۔ عوام کا جذبہ بھی خوب ہے۔ گولیاں کھا رہے ہیں۔ اور سینے کھول کر سڑکوں پر آرہے ہیں۔ انسان کی بھی عجیب نفسیات ہے۔ کبھی تو موت سے اس قدر ڈرتا ہے کہ ملیریا سے بھی خائف ہو کر گھبرا جاتا ہے اور کبھی بے اختیار خود ہی موت کے منہ میں کود پڑتا ہے۔ بات صرف جذبہ کی ہے۔ یہ جذبہ ہی ہے جو انسانوں کو بے خوف و نڈر بنا دیتا ہے۔ مارشل لاء کے احکامات بار بار ریڈیو سے نشر ہو رہے ہیں۔ مسلسل گولی مارنے اور متوقع سزائے موت کے احکامات سنائے جا رہے ہیں۔ اس ساری صورتِ حال کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ پاکستان کی مسلح افواج کو ایک بار پھر اقتدار کے تحفظ کی جدوجہد میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ عوام فوج سے محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے فوجیوں کو دیکھ کر پاک افواج زندہ باد کے نعرے لگائے تھے۔ انھیں پھولوں کے ہار پہنائے تھے۔ اب پھولوں کے بدلے گولیوں کا تحفہ ملا ہے تو حیران ہیں۔ خدا نہ کرے کہ یہ حیرانی نفرت میں تبدیل ہو جائے۔ اس ملک میں کم از کم ایک ادارہ تو ضرور ایسا ہونا

چاہیئے ، جس پر عوام کو اعتماد کسی نہ کسی حد تک رہے ۔ شاید سوچنے والے اس سمت سوچ رہے ہیں ۔ فی الحال تو حکومت کی جانب سے کیا جانے والا ہر اقدام جناب بھٹو کی ذات کو نفرت اور ملامت کا مزید نشانہ بناتا جا رہا ہے ۔ طاقت کے زور سے اگر امن قائم بھی ہو جائے جس کا فی الحال امکان نظر نہیں آتا تو بھی اس طرح لوگوں کے دل تو نہیں جیتے جا سکتے ۔

آپ جمعیت علماء پاکستان کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہوں گے ۔ فی الوقت پنجاب سے جمعیت کی پوری قیادت جمعیت کی مرکزی قیادت اور بیشتر صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے لئے نامزد کردہ اُمیدوار جیلوں میں ہیں ۔ یہی حال کم و بیش قومی اتحاد میں شامل دیگر جماعتوں کا ہے ۔ پھر بھی کارکنوں کے حوصلے بلند ہیں ۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ۔ مصطفےٰ بھائی ۔ ربانی بھائی اور سبحانی بھائی کو سلام — دیگر تمام دوستوں اور ساتھیوں کو سلام ۔ مولانا عبدالوہاب صاحب ۔ جناب غلام السیدین صاحب اور دیگر احباب اُمید ہے خیریت سے ہوں گے ۔ انھیں میرا سلام پہنچا دیں ۔ ہو سکے تو میاں ممتاز دولتانہ کی غیرت کو بھی جھنجھوڑ دیجئے ، مگر شرط یہ ہے کہ اس کی کوئی رمق ان میں باقی ہو — !

والسلام

خادم

ظہور الحسن بھوپالی

برادرم دوست محمد فیضی کے نام

جن سے میرے تعلق کو ۱۳ سال بیت گئے

...... تحریک زندہ ہے، یقین نہیں آتا کس طرح
زندہ ہے۔ شاید اس لئے کہ

نادیدہ بہاروں کا فسوں ٹوٹ چکا ہے !
پژمردگئی رنگ چمن بول رہی ہے !
ممکن ہے کہ لب ساکت و صامت رہیں لیکن
اے اہل وطن ارض وطن بول رہی ہے !

۱۷/ مئی ۷۷ء

برادرم فیضی۔ سدا خوش رہو

کئی روز سے تمہاری یاد آ رہی ہے۔ مگر مجھے موقع نہ مل سکا۔ کسی خاص مصروفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ یہاں اسپتال آنے کے بعد ہی طبیعت پر علالت کا غلبہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ میں واپس کراچی جیل جانے کے لئے بے تاب ہوں لیکن بیماری نے کچھ ایسی پیچیدگیاں اختیار کی ہیں کہ جانے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ یہاں آنے کے بعد انکشاف ہوا کہ میرے خون کا ای۔ ایس آر (E.S.R) ۸۲ ہے جب کہ ایک نارمل آدمی کا ۱۰ - ۱۵ کے درمیان ہوتا ہے پھر یہ کہ دوبارہ ٹیسٹ کے باوجود E.S.R میں ۱۵ دن کے علاج اور دواؤں کے استعمال کے باوجود کوئی خاص کمی نہیں ہوئی۔ خون کے ای۔ ایس۔ آر کو دراصل جسم کے اندر INFECTION کا پتہ لگانے کے لئے تھرمامیٹر کی حیثیت حاصل ہے اور اس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جسم میں کہیں نہ کہیں INFECTION موجود ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کے آپریشن اور موجودہ صورتحال سے ڈاکٹر سلیمان صاحب پوری طرح مطمئن ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گردے میں یا پیشاب کی نالی میں کہیں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ پیشاب کی تفصیلی جانچ پڑتال سے اس کی اس وقت تک کوئی واضح تصدیق نہیں مل سکی ہے رپورٹ میں معمولی جرثوموں

Becterias کے وجود کا پتہ چلا ہے مگر اس کی حیثیت ایسی نہیں ہے کہ کسی پرانے یا بڑے Infection کی واضح تصدیق ہو سکے دواؤں کے کثرت استعمال نے طبیعت میں کسلمندی پیدا کر دی ہے اور مسلسل طبیعت میں مالش، سستی اور نیند کے غلبے کے باعث بار بار کی کوشش کے باوجود میں تم سے مخاطب نہ ہو سکا۔ اب چار روز قبل سے ڈاکٹر سلیمان صاحب اور ڈاکٹر کرمانی صاحب کے مشورے سے تمام دوائیں کچھ دن کے لئے بند کر دی گئی ہیں۔ اور بھاری ایکسر سائز روز کرائی جا رہی ہے۔ اس سے کم از کم طبیعت کی کسلمندی دور ہو کر جولانی واپس لوٹنا شروع ہو گئی ہے۔ بازوؤں میں ایکسر سائز کے باعث درد ہے اور اس سے لکھنے میں تکلیف بھی ہو رہی ہے پھر بھی حالت بظاہر پہلے سے بہتر ہے۔ آئندہ ہفتہ دوبارہ آزمائشی ٹیسٹ ہوں گے تو اندرونی کیفیت کا اندازہ بھی ہو سکے گا۔

خیر۔ یہ تو تھا میری حالت کا ذکر۔ تم اپنی کہو۔ شاید آزادی کی نعمت سے محروم ہونے کے باعث کبھی کبھی تم پر اداسی کا غلبہ ہو جاتا ہو۔ مجھ تک تمہارے بھائی صاحب، غوث صاحب، محبوب بھائی اور صادق بھائی کے ذریعہ جو اطلاعات ملی ہیں ان سے بہر طور یہی پتہ چلتا ہے کہ تمہارے حوصلے اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح بلند ہیں۔ ساری بات یہ ہے کہ اگر دل کی گہرائیوں کے ساتھ یہ یقین اپنے دل میں بٹھا لیا جائے کہ ہماری قربانیاں کسی وسیع تر مقصد کے لئے ہیں جو ہماری ذات سے بالاتر ہے تو پھر انسانی وسوسوں اور اندیشوں سے خود بخود نجات مل جاتی ہے

موجودہ تحریک کے دوران ایسے لوگوں نے بھی اپنی جانیں دی ہیں جو محض راہ گیر یا تماشائی تھے۔ موت اگر آ ہی گئی ہے تو پھر وہ گھر

کے اندر کھانا کھا کر ہاتھ دھونے والے چمن (شعاع الحق صدیقی) کو بھی ہم سے جدا کر گئی ہے۔ اسی طرح سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسے افراد بھی پولیس تشدد اور گرفتاریوں کا نشانہ بن گئے جو بظاہر حالیہ عوامی تحریک سے الگ تھلگ تھے۔ ایسی صورت میں اگر ہماری قسمت میں قید و بند کی صعوبتیں ہی لکھی تھیں تو وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے یا کچھ نہ کرنے کے باوجود بھی ہمارے گلوں کا ہار بن سکتی تھیں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ گرفتاری اس لئے عمل میں آئی ہے کہ ہم نے ایک عظیم مقصد کے لئے آواز بلند کی تھی۔ اس قوم کی عظیم قربانیوں سے اگر اس ملک میں نظام مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ ہموار ہو جائے اور یہ ملک انصاف اور اسلام کے بتائے ہوئے انسانیت کے راستہ پر چل نکلے تو یقیناً قوم نے جو قربانیاں دی ہیں وہ ضائع نہیں جائیں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مقصد کی عظمت کے مقابلے میں قوم کی قربانیاں بہت زیادہ ہونے کے باوجود ہیچ ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات ذہن میں رکھو کہ ریفرنڈم کی پیش کش کے سلسلے میں مسٹر بھٹو نے اسمبلی میں جو خطاب کیا ہے اس نے ان کے عزائم کی قلعی کھول دی ہے وہ دانستہ یا نادانستہ اس امر کا اظہار کر گئے ہیں کہ ریفرنڈم تو وہ جیت ہی جائیں گے اور پھر اس ملک میں انقلابی تبدیلیاں کریں گے۔ یہ انقلابی تبدیلیاں ظاہر ہے کہ ان کے ذہن کی آئینہ دار ہوں گی۔ جس کی عکاسی ۱۹۶۲ء کے آئین اور پھر عبوری دستور کے سب سے ابتدائی مسودہ میں نظر آئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ وہ ایسا نظام چاہیں گے جو اپوزیشن کی نفی کر کے چل سکے

اس لئے اب تو کوئی ذرا بھی با اصول، باغیرت اور با ضمیر اس ملک کے مستقبل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریک کرنے۔ اسے دوسروں کی کالونی بنانے یا چیکوسلواکیہ جیسی ریاست بنا دینے کے لئے اپنا سر جھکا کر خود کو اس منصوبہ میں فریق بنانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

میرے بھائی میری پیشن گوئی یہ ہے کہ اگر بھٹو صاحب اس ملک کے حکمران رہ گئے تو یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا جائے گا۔ کیونکہ سوشلزم کے نعرے کا فریب اب پوری طرح بے نقاب ہو چکا ہے۔ پھر اندیشہ یہ بھی ہے کہ اس سارے تجربے میں کہیں پاکستان کا رہا سہا وجود ہی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ کیونکہ اس ملک کو مزید کسی تجربے کی بھینٹ چڑھانا دانشمندی نہیں۔ انصاف اور عدل پر مبنی فلاحی اسلامی ریاست کا تصور موجودہ دور میں صرف اور صرف آزادانہ جمہوری رائے کے ذریعہ ہی تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔

موجودہ دور میں سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ اسلام کو ذاتی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے اور اسلام کے تصور حکومت کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنے کے بجائے ساری بحث اس موضوع پر کی جانے لگی ہے کہ اسلام میں خلافت راشدہ کا نظام یک جماعتی نظام یا شخصی حکومت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اول تو یہ بہت بڑا بہتان ہے اور دوسرے ایسا کہنے والے اسلام کی عالمگیریت کے منکر ہیں۔ میں نہ تو کوئی عالم دین ہوں اور نہ ہی مورخ یا مفکر۔ اسلامی تاریخ کا میرا مطالعہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں اس بات کا بھی مدعی

نہیں کہ میری سوچ حرف آخر ہے۔ لیکن ایک عام مسلمان کی حیثیت سے میرا تجزیہ یہ ہے کہ فطری اور عالمگیر مذہب ہونے کے ناطے اسلام سائنسی، تمدنی اور سماجی ارتقاء کی نفی نہیں کرتا بلکہ چند مدون اصولوں کے تحت ایسے ہر ارتقاء کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے یا پھر اس کے بڑھتے ہوئے فطری اور سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

دراصل طرز حکومت کا انتخاب بھی انسان کے اسی تمدنی ارتقاء کے نتیجہ میں سماجی اور معاشرتی ماحول سے متاثر ہو کر کیا جاتا ہے میرے نزدیک ہر وہ طرز حکومت اسلامی ہے جو انسان کے سماجی اور معاشرتی ماحول سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ "اسلامی اصول حکومت" کی بنیاد پر استوار ہو۔ یعنی دراصل ایک اسلامی معاشرے میں بدلتے ہوئے تقاضوں اور سماجی حالات کے تحت "طرز حکومت" عالمگیر انسانی تبدیلیوں اور سوچ و فکر کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو سکتا ہے مگر اسلام کے بنیادی اصول حکومت ناقابل تبدیل ہیں یعنی اقتدار اعلیٰ کا مرکز خدا کی ذات۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعین کردہ تہذیبی، معاشرتی، سماجی اور اخلاقی ضوابط، قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی اور سربراہ مملکت کے فرائض اور ان سے متعلق دیگر اسلامی ضوابط ناقابل تبدیل ہیں۔ ان سب کو ہم اسلامی اصول حکومت کی اصطلاح میں بھی سمو سکتے ہیں۔

"خلافت راشدہ" کے دور میں امیر المومنین کے اختیارات اور پھر یک جماعتی اقتدار کا نعرہ لگا کر شخصی آمریت کا راستہ ہموار کرنے والوں کو میرا پہلا جواب تو یہ ہے کہ صحابہ اکرام

دراصل وہ نفوس قدسیہ تھے جن کے تقویٰ، پرہیزگاری اور عدل کی ضمانت خود کلام پاک نے اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد روئے زمین کے بہترین انسان تھے اور ان بہترین انسانوں کی موجودگی میں اسلامی ریاست کا سربراہ منتخب کرنے کا حق کسی اور کو کس طرح پہنچ سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے میں سے تقویٰ اور نیکو کاری میں سب سے آگے اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے قریبی ساتھی کو اپنا رہنما اور قائد چن لیا۔ کیا آج تقویٰ اور نیکو کاری کی بنیاد پر کسی انتخابی کالج کا قیام ممکن ہے اور اگر ایسے افراد کا فی زمانہ کوئی انتخابی کالج متعین کیا جائے تو اس کالج کے افراد کی بنیاد سربراہ کی ذاتی پسند ہوگی اس لئے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری ناپنے کا کوئی آلہ اب تک ایجاد نہیں ہو سکا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ عام لوگوں کی آزاد رائے کے ذریعہ ممکنہ حد تک بہترین نمائندوں کا انتخاب ہو۔ اور انتخاب میں کئی نمائندے سامنے ہوں تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ نظم و ضبط اور حکومت چلانے کی صلاحیت کا صحیح مظاہرہ کرنے کے لئے وہ منظم سیاسی جماعتوں سے متعلق ہوں۔

خلافت راشدہ کے سلسلے میں دوسری بات یہ سامنے رکھنی چاہیئے کہ اسلام فطری تقاضوں، سماجی، معاشرتی اور تمدنی اصولوں سے کہیں بھی متصادم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ان کی بتدریج اصلاح کرکے ان میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ عربوں میں اس وقت قبائلی نظام رائج تھا اور قبیلہ کے معاملات چلانے کے لئے قبیلہ کا سردار مطلق العنان ہوا

کرتا تھا۔ اسلام نے قبائل کے وجود کو چیلنج کئے بغیر اختلافات و تصادم کو ختم کر کے ایک ملت کی بنیاد رکھی۔ اس میں شک نہیں کہ امیرالمومنین کے انتخاب میں مختلف قبائل نے مل کر دراصل رائج الوقت طریقہ کار کے مطابق اپنا سردار ہی منتخب کیا۔ مگر اسلام نے ان میں جو انقلابی تبدیلی پیدا کر دی تھی اس بناء پر کوئی خود سے امیر ہونے کا دعویٰ کر کے سامنے نہیں آیا۔ اس لئے کہ ان میں امیر کی ذمہ داریوں اور اس عہدہ پر متمکن ہونے کی وجہ سے جو عظیم بوجھ اٹھانا پڑتا تھا اس کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بہترین انسانوں نے اپنے مثالی سردار کا انتخاب بلا کسی قبائلی ترجیحات کے چند گھنٹوں میں کر لیا۔

اس پس منظر میں ہم اور آگے بڑھیں۔ جب ان نفوس قدسیہ میں سے بیشتر جن کے تقویٰ اور بزرگی کی ضمانت دربار رسالت سے حاصل ہوئی تھی خالق حقیقی سے جا ملے اور اسلامی ریاست بھی دور دور تک پھیل گئی تو خلافت کے بعد ملوکیت کا دور آگیا یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ۳۰ سال کے اندر اندر اسلام اتنا بے اثر اور کمزور ہو گیا کہ ملوکیت سے نہیں بچ سکا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ دور پوری دنیا میں ملوکیت ہی کا دور تھا۔ اسلام اول تو ان نفوس قدسیہ سے محروم ہو گیا تھا جو خلافت راشدہ کے نظام کو جاری رکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں دوسرے یہ کہ اب اسلامی ریاست کا دائرہ جزیرہ نما عرب تک ہی محدود نہ تھا کہ اہل عرب بیٹھ کر کسی ایک شخصیت کا انتخاب کر لیتے بلکہ ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں تک پھیل چکا تھا۔ مملکت کی اس وسعت کا علاقائی سماجی اور تمدنی اثرات سے بھر عالمگیر

حالات سے متاثر ہونا ناگزیر تھا چنانچہ متاثر ہوئی اور ملوکیت کی راہ پر چل پڑی۔ لیکن جن مسلمان بادشاہوں نے اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اسلامی قوانین نافذ کئے اور ان پر عمل کیا تو انہیں ہم صرف بادشاہ ہونے کی وجہ سے کس طرح غیر اسلامی حکومت کا سربراہ کہہ سکتے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر میرا دل نہیں مانتا کہ عمر ابن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ۔ نورالدین زنگی رح، سلطان شمس الدین التمش رح اورنگ زیب عالمگیر رح کا دور غیر اسلامی ہو سکتا ہے۔ ایسی ہی بے شمار مثالیں ہیں جنہیں میں طوالت کے خوف سے نظر انداز کر رہا ہوں۔

انسانی ارتقاء کا قافلہ اور آگے بڑھا۔ پوری دنیا میں بادشاہت نے فوجی آمریت کا روپ دھارنا شروع کیا۔ اور پھر آجکل جمہوریت کا دور ہے۔ انسانی ارتقاء کا قافلہ اب پیچھے نہیں جا سکتا۔ جس طرح ہم آج کے تیز رفتار دور میں اونٹ پر سفر نہیں کر سکتے اسی طرح شخصی فوجی آمریت یا ملوکیت کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔ اس لئے کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ اسلام ارتقاء انسانی کا مخالف نہیں ہوائی جہاز کے دور میں اونٹ پر بیٹھ کر لاہور جانے والا پاگل یا احمق قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح جمہوریت کے دور میں ملوکیت یا شخصی فوجی آمریت یا ایک جماعتی نظام پر مبنی آمریت کی بات کرنے والا چڑیا گھر میں رکھے جانے کے قابل ہے اس لئے کہ وہ ارتقاء انسانی کا مخالف ہے اور اگر اپنی دلیل میں اسلام کو بطور مثال پیش کرنا چاہتا ہے تو دراصل وہ اسلام کا بھی دشمن ہے۔

خیر۔ چھوڑو۔ میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ بات یہ ہے کہ ہسپتال میں تنہائی کا احساس کچھ زیادہ ہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ گھر والے مل

جاتے ہیں مگر دن ورات کا بیشتر وقت تنہا ہی گزرتا ہے کئی دنوں کے بعد یہ سطور لکھتے ہوئے احساس تنہائی کچھ مٹ سا گیا ہے تصور میں ایسا لگتا ہے کہ تم سامنے بیٹھے ہو اور میں بولے جا رہا ہوں میری الجھی ہوئی فکر کے تانے بانے میں نے توازن کے ساتھ پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ نہ جانے میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔ تصور میں تم میری باتوں سے متفق نظر آرہے ہو مگر میں تم پر اس ضمن میں اعتماد کیسے کروں؟ اس لئے کہ تم تو میری ہر بات سے ہی جلد یا بدیر اتفاق کر لیتے ہو۔

بہر حال موجودہ حالات سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، مسلمان کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اور ہمیں تو خوش ہونا چاہئیے کہ ہماری کامیابی سب سے نمایاں ہے، ۲۴ رجون ۱۹۷۰ء کو دارالسلام (ٹوبہ ٹیک سنگھ) کی سنی کانفرنس میں جمیعت علماء پاکستان نے مقام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ اور نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کا نعرہ دیا تھا اور جب ہی سے اپنوں اور غیروں دونوں میں ہم نکتہ چینی کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اخبارات اور رسائل نے صفحے کے صفحے اس بات کو ثابت کرنے پر سیاہ کر دیئے کہ نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلط اصطلاح ہے اور آج ہر طرف نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا شہرہ ہے۔ ہم پس منظر میں چلے گئے تو کیا ہوا۔ ہم نے قوم کو جو نعرہ دیا تھا وہ تو آج بچہ بچہ کے دل کی دھڑکن اس طرح بن گیا ہے کہ کوئی اس سے گریز نہیں کر سکتا جس کو دیکھو بشمول پی۔ پی۔ یہی نعرہ ہے۔ نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نعرہ دینے میں علماء کے ذہن میں کیا حکمت عملی ہے اور اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ یہ دراصل الگ بحث ہے

اور تمہارا ذہن بھی اس بارے میں صاف ہے۔ اس لئے اسے دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں فی الوقت تو یوں سمجھو کہ منزل ہم سے دور نہیں اور قریب آگئی ہے۔

سنا ہے تم نے جنرل نیازی صاحب کے ساتھ پارٹنرشپ میں ٹیبل ٹینس کا میچ کھیل کر میر علی احمد تالپور اور نواب مظفر حسین صاحبان کو ہرا دیا۔ چلو کسی میدان میں تو تم نے ہاتھ دکھائے۔ ان تمام بزرگوں کو میرا اسلام کہنا۔ جنرل نیازی صاحب نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کے سلسلے میں بھٹو اور یحییٰ خان کے جس دباؤ کا انکشاف کیا تھا۔ اس کا ایک دستاویزی ثبوت میرے ہاتھ بھی لگ گیا ہے۔ تنہائی سے گھبرا کر اپنے پرانے مضامین پڑھ رہا تھا تو یہ بات ذہن میں تازہ ہو گئی کہ دسمبر کے تیسرے ہفتے میں جنگ بندی سے ایک یا دو دن قبل اس وقت کے نائب وزیراعظم اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے نیو یارک ٹائمز کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں کہا تھا۔

"جنگ فوراً بند کر دی جائے۔ جنگ جاری رکھنا دیوانگی ہوگی۔"

اب ذرا اس پس منظر میں ٹکا خان کا وہ بیان دوبارہ پڑھ لو جو انہوں نے جنرل نیازی کے خلاف دے کر حق نمک ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔

شاہ زید الحق صاحب پر اب بھی جولانی طبع طاری ہے یا کچھ مدہم پڑ گئی ہے۔ مولانا حقانی صاحب کے بارے میں یقین ہے کہ وہ "فل فارم" میں ہوں گے۔ ان حضرات کو اور جیل کے تمام ساتھیوں کو میرا اسلام پہونچا دو۔ اس لئے کہ سکھر جیل

کی لسٹ اس قدر طویل ہے کہ فرداً فرداً نام لکھنا مشکل نظر آ رہا ہے۔

یہاں حالات بدستور ہیں۔ تمہارا علاقہ زوروں پر جا رہا ہے خواتین کے جلوس روز نکل رہے ہیں جمعہ کو خواتین نے کرفیو بھی توڑ دیا اور اس قدر متاثرہ انداز میں فوجیوں کے ضمیر کو جھنجوڑا کہ ان میں سے بعض رو پڑے انہوں نے اپنی بندوقیں عورتوں کے حوالے کر دیں اور ٹوپیاں ان کے پیروں میں ڈال دیں کہ جلوس نہ نکالو۔ مگر عورتوں نے دوپٹے اتار کر ان کے قدموں میں ڈال دیئے اور بالآخر جلوس نکلا اور دھوم دھام سے نکلا۔ ظاہر ہے ان سب کی روح رواں قمر باجی ہیں جو اب محمودہ سلطانہ کی گرفتاری کے بعد قومی اتحاد خواتین ایکشن کمیٹی کراچی کی قائم مقام صدر بھی ہو گئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لانڈھی میں عورتوں کے ہر جلسے میں تمہارا ذکر آتا ہے اور تمہارے بھائی کو تمہارا خط ان کے لئے تبرک بن گیا ہے۔ ان خواتین کے جذبات کا اندازہ تو تمہیں اسی وقت ہوگا جب تم رہائی کے بعد لانڈھی پہونچو گے۔ تحریک کی طوالت کے باوجود عوام کے حوصلے بلند ہیں اور یہ یقین نہیں آتا کہ یہ جذبہ شکست کھا سکتا ہے۔ ہم اور ہم جیسے ہزاروں افراد بشمول خواتین جیلوں میں ہیں گویا خواتین تک نظر بند ہیں ۶۰۰ کے قریب افراد اس وقت تک جام شہادت نوش کر چکے ہیں مگر تحریک زندہ ہے یقین نہیں آتا کہ کس طرح زندہ ہے۔ شاید اسی لئے زندہ ہے کہ ؎

نادیدہ بہاروں کا فسوں ٹوٹ چکا ہے
پژمردگیٔ رنگ چمن بول رہی ہے

ممکن ہے کہ لب ساکت و صامت رہیں لیکن

اے اہل وطن ارض وطن بول رہی ہے

اپنے بھائی جان اور خالہ کی دعائیں قبول کرو۔ سب لوگ تمہیں یاد کرتے ہیں ۔ انشاء اللہ رنگ محفل ضرور لوٹے گا۔ آمین -!

تمہارا
ظہور بھائی

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

"یہ ضرور ہے کہ چاروں طرف کانٹے بکھرے پڑے ہیں مگر جب لوگ اپنے حوصلوں سے نئے راستوں کے تعیّن کا تہیّہ کر لیں تو تاریکیوں کے گھپ اندھیرے میں عزم کے چراغ جگمگانے لگتے ہیں۔ اور راستے کے بکھرے ہوئے کانٹوں کو روندتے ہوئے پاؤں کے زخمی ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا۔"

کراچی (جناح ہسپتال)
۵ر جون ۷۷ء

پیارے ضیاء - ڈھیروں سلام

تمہارا خط مجھے تقریباً ایک ماہ قبل ہی مل گیا تھا۔ مگر شدید خواہش کے باوجود جواب دینے میں تاخیر ہوتی رہی - تم کو سابقہ خط لکھنے کے چند دن بعد ہی میں جناح ہسپتال منتقل ہو گیا تھا اور یہاں سرجن سلیمان احمد خاں صاحب کے زیرِ علاج ہوں - اس طرح تم سے تقریباً پونے دو ماہ بعد مخاطب ہوں - اس عرصے میں حالات مزید کئی کروٹیں لے چکے ہیں - تم کو جب میرا یہ خط ملے گا تو اس وقت تک ممکن ہے ملک کے سیاسی بحران کو حل کرنے کے لئے قومی اتحاد اور حکومت کے درمیان مذاکرات کا کوئی نتیجہ برآمد ہو چکا ہو - مگر فی الحال کسی کو بھی بہت زیادہ امید نہیں ہے -

تم نے اخباروں میں یہ پڑھ لیا ہو گا کہ اسلام آباد کے قریب سہالہ ریسٹ ہاؤس میں قومی رہنماؤں کو ایک جگہ نظر بند کر کے اور رابطہ قائم کر کے مذاکرات کی جو کوششیں کی گئی تھیں ان میں ناکامی کے بعد رہنماؤں کو مختلف جیلوں میں بھیجا گیا اور پاکستان کی موجودہ تاریخ میں ان رہنماؤں سے بدسلوکی کا مظاہرہ کر کے ایک اور سیاہ باب کا اضافہ کر دیا گیا۔

اب دوبارہ براہ راست مذاکرات شروع ہونے سے قبل

رہنماؤں کو رہا کیا جا چکا ہے۔ لیکن جو بدسلوکی کی جا چکی ہے ظاہر ہے اس کا ازالہ تو ممکن نہیں سوائے اس کے کہ پاکستان موجودہ سنگین بحران سے کامیابی کے ساتھ نکل جائے۔

قبلہ مولانا نورانی صاحب کل اپنی رہائی کے بعد ازراہ شفقت میری اور حاجی زاہد علی صاحب کی عیادت کے لئے تشریف لائے تھے۔ حاجی زاہد علی صاحب بھی ان دنوں ہسپتال میں ہیں۔ ان کی پرانی تکلیف نے دوبارہ زور پکڑ لیا ہے۔ وہ بھی ڈاکٹر سلیمان کے زیرِ علاج ہیں۔ حاجی صاحب کی آمد اور یہاں کی محفلوں کا ذکر تو بعد میں کروں گا۔ اس وقت تو میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سہالہ سے واپسی پر مولانا نورانی صاحب کے ساتھ کیا گذری۔ مولانا کو پروفیسر غفور احمد کے ساتھ کراچی کے ہوائی اڈہ سے جیپ کے ذریعہ گرمیوں کے اس موسم میں دادو لے جایا گیا۔ پروفیسر غفور احمد تو دادو جیل کی انتظامیہ کے حوالے کر دیئے گئے اور مولانا سندھ بلوچستان سرحد پر واقع جیکب آباد کے ایک قصبہ گڑھی خیرو میں لے جائے گئے۔ گڑھی خیرو جیکب آباد کے ضلعی ہیڈ کوارٹر سے بھی تقریباً چھبیس میل آگے ہے۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ جیکب آباد کا شمار برصغیر کے گرم ترین علاقے میں ہوتا ہے۔ وہاں کوئی باقاعدہ جیل نہیں ہے اور اسی لئے مولانا کو گڑھی خیرو کی پولیس لاک اَپ یعنی حوالات میں رکھا گیا۔ اس چھوٹی سی حوالات میں نہ بجلی کا کنکشن تھا اور نہ ہی پلنگ وغیرہ کا انتظام۔ مولانا کو اس قیدِ تنہائی میں اخبارات اور جرائد تو کجا لکھنے پڑھنے کی کتابوں سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اور ساتھ ہی ان کے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ بھی جمع کرائی گئی۔ جب ملک بھر میں اس بدسلوکی کے خلاف احتجاج ہوا اور لوگ دُور دراز علاقوں سے گڑھی خیرو میں جمع ہونا شروع ہوئے

تو انھیں خیرپور جیل منتقل کر دیا گیا۔

رہائی کے بعد مولانا کل ہم سے ملنے آئے تو ہم نے پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیا کہ ان کا وزن خاصا کم ہو چکا ہے۔ چہرے پر سُرخی ختم ہو چکی تھی اور زردی ظاہر ہو رہی تھی۔ مگر اس زردی میں بھی ہمیں ایک عجیب و غریب مومنانہ چمک نظر آئی۔ ان کے چہرے پر عزم و استقلال کی جھلک اور گفتگو میں وقار اور ٹھہراؤ پہلے سے زیادہ راسخ نظر آیا۔ ان کی گفتگو ان کی جراٗت کی مظہر تھی۔ انھوں نے ہمیں اپنے ساتھ ہونے والی بدسلوکیوں کی نہ تو کوئی داستاں سنائی اور نہ ہی حکومت کے روّیہ کا شکوہ کیا۔ ہم نے ان کی قربانیوں کا ذکر کر کے جونہی خراجِ تحسین پیش کرنا چاہا تو فوراً ہی ہماری بات کاٹ کر انھوں نے قوم کی ان قربانیوں کا ذکر شروع کر دیا جو حالیہ تحریک کے دوران عوام نے دی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ قوم کی ان قربانیوں کے سامنے کسی فرد یا ذات کی بڑی سی بڑی قربانی بھی ہیچ ہے۔ انہوں نے ہم پر زور دے کر کہا کہ نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل حاصل کرنے کے لئے ہم سب کو مستقبل میں بھی اس سے کہیں زیادہ سختیاں جھیلنی ہوں گی۔ حکومت کے بارے میں ان کا تند و تلخ روّیہ بدستور برقرار تھا۔ اور وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ بڑی سے بڑی سختی ہمارے اندر کوئی لچک پیدا نہیں کر سکتی۔ ہم جسے ظلم سمجھتے ہیں اسے ظلم کہتے رہیں گے۔ ہم جسے باطل سمجھتے ہیں اسے باطل کہتے رہیں گے اور کسی طور بھی آوازِ حق بلند کرنے سے ہمیں باز نہیں رکھا جا سکتا۔

میرے دوست تم نے ہمارے ساتھ خاصا طویل وقت گذارا ہے مولانا کے مزاج سے تم بھی بخوبی واقف ہو۔ اس لئے مجھے ان کی آج کل کی کیفیت کا پورا نقشہ کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے

کہ آج کل مولانا اقبالؒ کے اس شعر کی مکمل تفسیر بنے ہوئے ہیں ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

مولانا شاید آج اسلام آباد چلے جائیں یا ممکن ہے چلے گئے ہوں حکومت سے مذاکرات کی دوسری نشست کل دوبارہ ہو رہی ہے لوگ ابھی کسی نہ کسی نتیجے کے منتظر ہیں مگر ایک بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جو قومی اتحاد کے مذاکرات کی میز پر جانے سے خوش نہیں ہے اشتعال کی جو فضا تشدد نے پیدا کر دی ہے اس میں یہ سوچ انہونی نہیں ہے کیونکہ تحریک کی راہ میں جان دینے والوں کی تعداد اب تو چھ سو سے بھی زائد ہو چکی ہے۔ ایک لاکھ کے قریب افراد پس دیوار زنداں ہیں۔ جذبات مشتعل ہوں تو بات چیت بہت سے لوگوں کے لئے اظہار ناراضگی کا سبب بنتی ہے۔ پھر بھی مجموعی طور پر عوام کو قومی اتحاد کی قیادت پر مکمل اعتماد ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے سچ پوچھو تو مجھے نہ تو کوئی تشویش ہے اور نہ ہی کسی قسم کی آزردگی کا احساس۔ میرا یقین مجھے یہ تسکین دے رہا ہے کہ نورانی میاں کی موجودگی میں کوئی ایسا فیصلہ ممکن ہی نہیں ہے جس پر میں پریشانی میں مبتلا ہو سکوں۔

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (این۔ ڈی۔ پی) کے صدر سردار شیر باز مزاری کو رہائی سے ایک دن قبل چیک اپ کے لئے جناح ہسپتال لایا گیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے میرے برابر ہی کے کمرے میں مقیم رہے اور انھیں یہیں پروانۂ آزادی ملا۔ سردار صاحب نے گفتگو کے دوران بہت سی دلچسپ تفصیلات بتائیں

میانوالی جیل میں ان کے اور عام سیاسی قیدیوں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کی گئیں ان کی تفصیلات سن سن کر ہمیں تہذیب و شائستگی کی دھجیاں فضا میں بکھرتی نظر آئیں۔ ان کے روّیہ سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ بھی قومی اتحاد کے موقف میں بہت سخت ہیں۔ آج کے اخبارات میں رہائی کے بعد ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خاں کی جو پریس کانفرنس شائع ہوئی ہے اس سے ان کے موقف کی بھی سختی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی رہنماؤں کے بارے میں بھی جو تفصیلات ملتی رہی ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ قومی اتحاد کے تمام قائدین عوامی احساسات کے خلاف کسی سمجھوتے کے موڈ میں نہیں اور وہ جو بھی فیصلہ کریں گے وہ یقیناً قوم کے بہترین مفاد میں ہوگا۔

یہ تو رہی سیاست کی بات یہاں ہسپتال میں شروع میں تو تنہائی کا احساس غالب رہا مگر اب حالات معمول پر آچکے ہیں۔ حاجی زاہد علی کے آنے سے رونق دوبالا ہوگئی۔ کسی حد تک محفلیں شروع ہوگئی ہیں اور رات کو جب کھانے کے بعد میں ٹہلنے کے لئے نکلتا ہوں تو بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے ٹہلنے کے بعد ہسپتال کے لان پر محفل سجتی ہے۔ سبز چائے کا دور چلتا ہے۔ سیاست حاضرہ پر تبصرے کئے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اسمبلی کے دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے تو تمہارا بھی ذکر آجاتا ہے۔ حالات اگرچہ ابھی تک بہت زیادہ پُرامید نہیں ہیں مگر دل کے کسی نہ کسی گوشہ سے یہ آواز بار بار آتی ہے کہ وہ محفلیں پھر تازہ ہوں گی۔ یہ ضرور ہے کہ چاروں طرف کانٹے بکھرے پڑے ہیں مگر جب لوگ اپنے حوصلوں سے نئے راستوں کے

تعین کا تہیہ کر لیں تو تاریکیوں کے گھپ اندھیرے میں عزم کے چراغ جگمگانے لگتے ہیں اور راستہ کے بکھرے ہوئے کانٹوں کو روندتے ہوئے پاؤں کے زخمی ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اس لئے دل کا یہ احساس بہت قوی ہے کہ اب جب تم وطن واپس آؤگے تو ایک بہتر اور سازگار ماحول پاؤگے۔ جذبے کبھی سرد نہیں ہوتے اور وہ وقت قریب ہے کہ جب عوام کے موجودہ جذبات کا دھارا قومی تعمیرِ نو کی طرف موڑ دیا جائے گا۔ ہماری محفلوں میں مریض بھی ہوتے ہیں اور ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ رہنے والے تیمار دار بھی۔ ان میں ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں اور اکا دکا ملاقاتی بھی۔ شروع میں میری نگرانی پر متعین جو پولیس کا عملہ ہے وہ اس صورتِ حال سے خاصا پریشان تھا مگر اب کسی حد تک وہ بھی اس کا عادی ہو گیا ہے۔ اور ان دنوں جب سے مذاکرات کی خبریں شروع ہوئی ہیں پہرے میں بھی نرمی آگئی ہے۔ صبح کے وقت ورزش کے لئے میں فزیو تھریپی ڈیپارٹمنٹ چلا جاتا ہوں۔ وہاں بھی جاتے ہی ہر طرف سے کیا ہو رہا ہے؟ اور کیا ہو گا؟ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کچھ دیر ورزش میں اور کچھ وقت بات چیت میں کٹ جاتا ہے۔ واپسی پر عموماً ساڑھے گیارہ بج جاتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب تشریف لے آتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد حاجی زاہد علی کی قیادت میں کھانا کھایا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد سو جاتے ہیں۔ اٹھتے ہیں یا اٹھائے جاتے ہیں تو گھر سے کوئی نہ کوئی ملنے آجاتا ہے۔ مغرب کے بعد ریڈیو سننے کی بے چینی ہوتی ہے۔ پھر کھانا کھاتے ہیں اور کھانا کھا کر پھر وہی چہل قدمی اور محفل شروع ہو جاتی ہے۔ وقت تیزی سے گذر رہا ہے اور جو رہ گیا ہے وہ بھی اسی تیزی سے گذر جائے

گا۔ جہاں تک میری صحت کا تعلق ہے اسے ٹھیک تو قرار نہیں دیا جا سکتا مگر اب چلنے اور بیٹھنے میں نسبتاً کم تکلیف ہوتی ہے البتہ لیٹنے کے بعد اٹھنا یوں سمجھ لو میرے لئے ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی صحت مند آدمی کے لئے بالکل سیدھی پہاڑی پر چلنا۔

ہماری یہاں کی محفلوں میں اسپیشل وارڈ کے انچارج ڈاکٹر افتخار کے علاوہ ڈاکٹر اشفاق، ڈاکٹر خالد اور ڈاکٹر ریاض بھی کبھی کبھی شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ سب نوجوان ڈاکٹر ہیں۔ میں نے ان میں اخلاص اور اپنے فرض سے محبّت کا گہرا جذبہ محسوس کیا۔ اور یوں بڑی حد تک اس عام خیال کی تردید ہو گئی کہ ہمارے نوجوان ڈاکٹر اپنی ذمہ داریاں اور پیشہ ورانہ فرائض سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو کسی بھی جان بلب مریض کو بچانے کی کوشش میں رات رات بھر جدوجہد کرتے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر افتخار اگرچہ خود مریض ہیں۔ اُن کا حال ہی میں "ران" کا آپریشن ہوا ہے۔ اور بڑی مقدار میں پس نکالا گیا ہے۔ وہ چھٹی پر ہیں۔ مگر بیماری کے باوجود پیشہ ورانہ فرائض نے اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے ڈاکٹر اشفاق صرف ڈاکٹر ہی نہیں "ستم رسیدہ" بھی ہیں۔ انہیں سول ہسپتال سے ایک "مبینہ بوگس الزام" میں نکالا گیا جس کے بوگس ہونے کا مبینہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے گواہ عادی جرائم پیشہ تھے اور ان کے خلاف یکم اگست ۷۶ء کو کیس بنایا گیا تھا جس کا آج تک چالان بھی عدالت میں پیش نہیں ہوا۔ جنوری سے وہ جناح اسپتال میں تھے لیکن اب یہاں سے بھی بغیر وجہ بتائے برطرفی کا حکم نامہ مل گیا ہے۔ اور شاید اسی لئے وہ ان دنوں بہت زیادہ مایوس اور پریشان ہیں۔ مگر زندہ دل نوجوان ہیں اس لئے دل کا بوجھ زبان پر نہیں آتا۔

اسپیشل وارڈ کی جونیر ڈاکٹروں میں ڈاکٹر دلآرام اور ڈاکٹر شاکرہ بھی خوش اخلاق، محنتی اور احساسِ ذمہ داری سے سرشار ہیں۔ میں ان سب کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک کے سارے "ڈاکٹر" اسی جذبہ اور احساس سے معمور ہو جائیں تو سرکاری ہسپتالوں سے کسی کو شکوہ نہ رہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ہسپتالوں کی بدحالی میں بنیادی کردار ناقص انتظامی معاملات ہیں، جس کے باعث دواؤں، ڈاکٹروں، گنجائش کی کمی اور عدم توجہ کی شکایات عام ہیں۔

جمعیت العماء پاکستان کو اس دوران ایک بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ تھا جناب رفیق احمد باجوہ کی علیحدگی۔ انھیں قومی اتحاد کی مرکزی کمیٹی سے منظوری حاصل کئے بغیر مسٹر بھٹو سے ملاقات کرنے پر جمعیت اور قومی اتحاد سے نکالا گیا۔ باجوہ صاحب کے ساتھ جو کچھ ہوا اور وہ کیوں کر اور کس طرح بھٹو صاحب سے ملے یا انھیں ملاقات پر مجبور کیا گیا یہ ساری باتیں متنازعہ ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جمعیت کی کارروائی کا خیر مقدم کیا گیا۔ میری ان واقعات کے بعد باجوہ صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی مگر نہ جانے کیوں دل یہ نہیں مانتا کہ انھوں نے تحریک کے مفادات سے کوئی غداری کی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ ان کا وہ حلف نامہ ہو جو قرآن پاک کی قسم کے ساتھ نوائے وقت میں شائع ہوا تھا کہ "میں قرآن کریم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کوئی سودے بازی نہیں کی۔ میں آج بھی قومی اتحاد اور تحریک نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا وفادار ہوں۔"

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ باجوہ صاحب سے تعلق خاطر

ہو۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے قومی اتحاد کے قیام اور اس کے منشور اور دستور کی تیاری میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ مظلوموں کی قانونی دادرسی، سیاسی نظربندوں کی ہائی کورٹ کے ذریعہ رہائی کے لئے بلامعاوضہ پیروی، اردو ڈائجسٹ اور زندگی جیسے جرائد کی عدلیہ کے ذریعہ بحالی میں انکا کردار مثالی رہا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئے اور جمعیت العلماء پاکستان نے ان سے بہترین توقعات وابستہ کرلیں مگر ایک سیاسی حماقت یا سنگین غلطی نے انھیں آسمان سے زمین پر پہنچا دیا۔ اس حادثے نے ان کا کیا حال کیا ہوگا؟ اس کا تصور آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ میں اسی لئے ان کے بعد کے چند بیانات کو ان کی اسی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار سمجھتا ہوں۔ میں انھیں سیاسی طور پر بددیانتی کا الزام نہیں دے سکتا۔ صرف سیاسی ناتجربہ کاری اور غیر دانشمندی اور اپنوں کے بجائے "غیروں" پر بھروسہ کرنے کی عادت کو ان کے اور ہمارے اس نقصان کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ یہ میری ذاتی رائے ہے اور ہوسکتا ہے بہت سے لوگ اور ممکن ہے ہماری اپنی جمعیت کے بیشتر ساتھی میری اس رائے سے اتفاق نہ کریں مگر میرے دل کی خواہش یہی ہے کہ کاش ہم ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے صحیح سمت میں بھرپور فائدہ اٹھا سکتے اور کاش اٹھا سکیں۔

تم نے اخبارات میں یہ بھی پڑھ لیا ہوگا کہ مشرقی کمان کے ۱۹۷۱ء کے کمانڈر جنرل امیر عبداللہ نیازی بھی جمعیت العلماء پاکستان میں شامل ہوگئے ہیں۔ انتخابی مہم کے دوران اور پھر حالیہ تحریک میں ان کو ہر جگہ جو زبردست استقبال ملا ہے،

شاید تم اس کا صحیح تصوّر نہ کر سکو۔ انتخابی مہم کے دوران ناظم آباد دوسری چورنگی پر الیکشن سے چند روز قبل انھوں نے جس جلسے سے خطاب کیا تھا وہ حالیہ انتخابی مہم کا سب سے بڑا جلسہ کہا جا سکتا ہے۔ ناظم آباد چورنگی ۲ پر اسٹیج بنایا گیا تھا اور گولی مار تک عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اسی طرح اسٹیج کے اطراف میں کشادہ سڑکوں پر دور دور تک سننے والوں کا اتنا بڑا ہجوم تھا کہ وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ تم اس سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ اسٹیج تک پہنچنے کی کوشش میں کارکنوں کی کوشش اور عوام کے تعاون کے باوجود میرا چشمہ ٹوٹ گیا۔ شرٹ پھٹ گئی اور چپلیں کھو گئیں یہ جلسہ جناب محمود اعظم فاروقی کے انتخابی حلقہ میں ہوا مگر کراچی کے گوشہ گوشہ کے لوگ وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ تمہارے ساتھی دوست محمد فیضی نے بھی اس جلسہ سے خطاب کیا تھا اور اُس پر اسی جلسے کی تقریر کا مقدمہ بنا لیا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کا المیہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے اصل اسباب پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ جنرل نیازی نے کیوں ہتھیار ڈالے۔ خود ان کے الفاظ میں اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ انھیں ۱۳ر دسمبر ۷۱ء کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر وہ مسلسل آخری دم تک جدوجہد کی ضرورت پر زور دیتے رہے۔ بالآخر جب انھیں مغربی پاکستان کی فوجی صورتِ حال کا بھیانک رخ دکھا کر شدت کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا تو ایک سپاہی کی حیثیت سے انھیں وہ حکم ماننا پڑا۔ جب ان کے سامنے حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تو انھوں نے ۱۷ر دسمبر کو اس عبرتناک رسوائی کو قبول کیا جس کا انتقام لینے کے لئے آج بھی ان کا سینہ جل رہا ہے۔ میں ان دنوں روزنامہ جنگ

میں اپنے پرانے مضامین کی فائل پڑھتا رہا ہوں اور پرانی فائلوں سے بعض ایسے بیانات بھی میری نظروں سے گذرے ہیں جن سے جنرل نیازی کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ ۱۹ر دسمبر کو سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان نے جو بیان دیا تھا وہ خصوصی طور پر قابل توجہ ہے۔ جناب اصغر خان نے سانحہ مشرقی پاکستان کے بارے میں فوجی کاروائی سے لے کر سقوط تک جو موقف اختیار کیا اس کی روشنی میں ان کا ۱۹ر دسمبر کا بیان دراصل ان کے جراَت مندانہ طرز اظہار کا مظہر ہے۔ ویسے بھی تم جانتے ہو کہ جناب اصغر خاں مولانا نورانی صاحب قبلہ کا اور خود مولانا اصغر خاں صاحب کا احترام کرتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کے سیاسی موقف میں بہت زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) نے اپنے ۱۹ر دسمبر کے بیان میں کہا تھا۔

"صدر یحییٰ پر ملک کو تباہ کرنے۔ وطن کی تذلیل کرنے۔ فوج کو تباہ کرنے۔ آئین کو کالعدم قرار دینے اور فوج کو اپنے مقدس وطن کا دفاع کرنے سے روکنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے کیونکہ وہ صدر اور کمانڈر انچیف کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ انھوں نے جنرل نیازی سے ہتھیار ڈلوائے اور مغربی پاکستان سے فوری حملہ نہ کر کے مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے کا موقعہ فراہم کیا — جنرل نیازی رسوا کن طریقہ سے ہتھیار ڈالنے پر کسی طرح آمادہ نہیں تھے۔ ان سے یہ بجبر کرایا گیا۔

جنرل نیازی نے بار ہا صدر یحییٰ سے کہا کہ وہ مغربی محاذ سنبھالیں لیکن صدر یحییٰ نے یہاں بھی مسلح افواج کو پیش قدمی سے روک دیا۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں اسّی نوے ہزار فوج کو کبھی قیدی نہیں بنایا گیا۔ یحییٰ خان نے جنرل نیازی جیسے بہادر سپاہی کو رسوا کیا۔"

میں نے ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان صاحب کے بیان کا صرف وہ حصّہ نقل کیا ہے جو مشرقی کمان پر جنرل نیازی کے کردار سے متعلق تھا۔ اسی طرح پاکستان قومی اتحاد کے موجودہ صدر مفتی محمود صاحب نے بھی ۱۹ر دسمبر کو ملتان میں بیان دیتے ہوئے یہ کہا تھا۔

"ایک مسلمان دس بھارتی بزدلوں پر بھاری ہوتا ہے اور اس کا ثبوت مشرقی محاذ پر لڑنے والے مجاہدین نے فراہم کر دیا۔ میں یہ نہیں مانتا کہ جنرل نیازی نے اپنی مرضی سے ہتھیار ڈال دیئے ہوں اور وہ بھارت کے قیدی بنے ہوں۔ اس لئے بھارتی فوج کے داخلے سے چند منٹ قبل تک ہمارا ریڈیو یہ کہتا رہا کہ جنرل نیازی نے کہا ہے کہ وہ باعزت اور باوقار موت کو غلامی پر ترجیح دیں گے لیکن چند منٹوں کے بعد ڈھاکہ میں بھارتی فوج کے داخلے کی منحوس خبر سنائی گئی۔ عوام یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ سب کیوں ہوا؟ کس طرح ہوا اور اس کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ اس لئے اس المیے کے قومی مجرموں کو

سزا ملنی چاہیئے۔"

یہ ساری باتیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ جنرل نیازی کا دعویٰ غلط نہیں ہے اور ویسے بھی اس دوران جنرل نیازی کے قریب رہنے کا مجھے جو موقع ملا اس میں میں نے انھیں ایک سیدھا سادھا مسلمان پایا۔ مولانا عبدالستار نیازی قبلہ کی طرح میانوالی کی روایتی پگڑی میں بھی وہ اب بھی سپاہی ہی نظر آتے ہیں۔ مولانا نورانی اور مولانا نیازی صاحبان سے وہ بہت متاثر ہیں اور نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل پر یقین رکھتے ہیں۔
مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی ابھی بدستور جیل میں ہیں۔ وہ تحریک کے اوّلین اسیروں میں سے ہیں۔ اور جب سے مسلسل اسیر ہیں۔ ویسے بھی ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے گذرا ہے۔ ۱۹۵۳ء کی ختم نبوّت کی تحریک میں بھی وہ کافی عرصہ تک جیل میں رہے اور انھیں پھانسی کی سزا بھی دی گئی تھی۔ یوں وہ قید و بند کے معاملات میں سب سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ ان کی سیدھی سادھی مجاہدانہ زندگی سے اگر جنرل نیازی متاثر ہیں تو یہ قطعی فطری اور حقیقی ردعمل ہے۔

قبلہ مولانا نیازی کی ذات ہم سب کے لیے عزم و حوصلہ کا مینار ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کی قیادت میں تحریک نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قافلہ رواں دواں ہے اس کے راستے کی دیوار، رکاوٹیں جلد ہی دور ہو جائیں گی۔

میں نے تم سے نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرلیں معلوم نہیں تحریر میں ربط بھی باقی رہ سکا ہے یا نہیں مگر کیا کروں۔ خیالات کا

دھارا ہے جو رکنے ہی میں نہیں آتا۔ وقت کی زنجیریں مزید کچھ لکھنے سے روک رہی ہیں ۔ اس لئے اب رخصت ہوتا ہوں یہاں تمام لوگ بخیر ہیں اور حالیہ واقعات نے ہر ایک کو ایک نئے رنگ میں ڈھال دیا ہے ۔ اب جب تم واپس آؤ گے تو چہرے تو پرانے ہوں گے مگر عزم نو کے چراغ ہر طرف جگمگاتے ہوئے دیکھو گے اور ہر چہرہ تم کو روشن نظر آئے گا۔

تمہارا اپنا

ظہور بھوپالی

عصبیت اور منافرت کا ذمہ دار کون؟

رہ وطن میں شہیدوں نے کیوں دیا تھا لہو
اسی لئے کہ تعصب یہاں جنم پائے

چراغ خون سے کیا اس لئے جلائے تھے
سجے سجائے ہوئے گھر میں آگ لگ جائے

۱۰ ار جون ۸۸ء
جناح اسپتال

محترم شام صاحب تسلیمات

امید ہے آپ ٹھیک ٹھاک ہوں گے

ہفت روزہ معیار میں ممتاز بھٹو کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ یہ انٹرویو آپ نے لیا تھا اور حکمراں جماعت کے دیگر رہنماؤں سے بالعموم اور ممتاز صاحب سے بالخصوص آپ کے جو تعلقات ہیں ان کی روشنی میں ظاہر ہے کہ آپ نے اپنی جانب سے کوئی منفی حاشیہ آرائی نہیں کی ہوگی۔ ویسے بھی آپ نے جس انداز سے رپورٹنگ کی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی جانب سے جناب ممتاز بھٹو کے بارے میں عام تاثر دور کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اگر اس انٹرویو کو غور سے پڑھا جائے اور اس کے ساتھ آپ نے سکھر کی جو تقریر نقل کی ہے اس کا جائزہ لیا جائے تو ساری احتیاطوں کے باوجود ممتاز صاحب کا اصل روپ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ میرا مقصد ان سطور میں ممتاز صاحب کی گفتگو کو زیر بحث لانا نہیں ہے بلکہ سندھ میں عمومی طور پر نئے سندھیوں کے بارے میں ملازمتوں سے لے کر تعصب تک جو غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں ان کا

جائزہ لینا ہے۔ لیکن پھر بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ انٹرویو اور تقریر کے بعض حصوں کی طرف دلاتا چلوں تاکہ ریکارڈ درست رہے۔

ممتاز صاحب نے حالیہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے یہ گوہر افشانی فرمائی ہے۔

"حیدر آباد اور کراچی میں ایک محدود طبقہ نے سندھیوں کی نشاندھی کر کے انہیں مارا، ان کے گھر جلائے، دکانیں نذر آتش کیں۔"

اسی طرح ممتاز صاحب نے اپنی تقریر میں (آپکی رپورٹنگ کے مطابق) یہ کہا کہ

"ایسے لوگ کراچی میں ہیں جو کسی اجرک یا ٹوپی والے سندھی کو دیکھتے ہیں تو بے عزتی کرتے ہیں"

انہوں نے کشمور سے کراچی تک جلوس کے اعلان کا ذکر کرتے ہوئے یہ دعویٰ بھی فرمایا ہے کہ کراچی، اور حیدرآباد میں پرانے سندھیوں کے خلاف نفرت پیدا کی جا رہی ہے

محترم شام صاحب! یہ سارے الفاظ آپ کے رسالے سے لئے گئے ہیں اور ان کا مقصد سندھ کے معصوم اور سادہ لوح عوام میں اشتعال پیدا کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے اور یقیناً یہ آپ کے علم میں بھی ہو گا کہ حالیہ تحریک خالصتاً حکومت کے خلاف تھی اور اس میں کسی مرحلے پر پرانے یا نئے سندھی کا تصور پیدا نہیں ہوا۔ تحریک کے دوران گرفتار ہونے والوں میں پرانے سندھی کثیر تعداد میں شامل ہیں اور

سانگھڑ اور تھر پارکر کے علاقوں میں انہوں نے جانیں بھی دی ہیں اس پوری تحریک کے دوران کسی سندھی کے خلاف محض سندھی ہونے کے باعث کراچی اور حیدرآباد میں اشتعال انگیزی کا الزام سفید جھوٹ ہے اور اگر ایسا کوئی واقعہ ہوتا تو ممتاز بھٹو صاحب حبیب الرحمٰن خٹک اور اللہ بندے کے واقعات کے ساتھ اسکا ذکر نامزد کرکے ضرور کرتے جبکہ ممتاز صاحب نے خٹک اور اللہ بندے کے واقعات کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے اور انکی گولیوں سے شہید ہونیوالوں کا ذکر نہ کرکے سندھی عوام میں خواہ مخواہ کی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ دونوں قدیم سندھی نہیں تھے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ کراچی اور حیدرآباد میں بعض لوگ اجرک اور سندھی ٹوپی پہننے والوں کی بے عزتی کرتے ہیں۔ ایک اور مضحکہ خیز الزام ہے۔ شاید آپ کے علم میں ہو غریب آباد، لیاقت آباد اور گلشن اقبال جیسے علاقوں کے لئے جمیعت العلمائے پاکستان کے رہنما مولانا غوث محمد شاہ جیلانی قومی اتحاد کے نامزد نمائندے تھے جن کا ان علاقوں کے رہنے والوں نے جس بھرپور انداز میں ساتھ دیا ہے اس سے ممتاز بھٹو صاحب کے پروپیگنڈے کی تردید ہوتی ہے۔ جبکہ مولانا جیلانی مسٹر ممتاز بھٹو صاحب سے زیادہ پرانے سندھی ہیں اور ممتاز بھٹو یہ بھول گئے کہ کراچی کے متعدد نمائندوں نے سابقہ سندھ اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں سندھ کی روایتی ٹوپی اور اجرک اوڑھ کر حلف اٹھایا تھا۔ حالانکہ ممتاز صاحب کو سندھی ٹوپی یا پگڑی کا خیال ایوان حکومت میں نہیں۔ محض عوام کے سامنے آتا ہے۔ ان کی اطلاع کے لئے یہ بھی عرض ہے کہ کراچی کے سب سے زیادہ حساس علاقہ لیاقت آباد کی ایک بڑی مسجد "قوت الاسلام"

میں خطیب کے فرائض انجام دینے والے مولانا غلام عباس قادری صاحب اور سعود آباد کی مسجد طیبہ کے امام مولانا عبدالباری صاحب، ممتاز صاحب سے زیادہ قدیم سندھی ہیں۔ وہ سندھ کی روایتی ٹوپی بھی پہنتے ہیں اجرک بھی اوڑھتے ہیں اور ان خالص مہاجر علاقوں میں ممتاز صاحب کی خیالی مقبولیت سے کہیں زیادہ نہ صرف یہ کہ مقبول ہیں بلکہ عوام میں ادب و احترام کا قابل رشک مقام رکھتے ہیں۔ یہ محض چند مثالیں ہی نہیں ہیں بلکہ کراچی اور حیدر آباد میں ایسے سینکڑوں زندہ جاوید حقائق موجود ہیں جن کی موجودگی میں ممتاز صاحب کی دروغ گوئی کو کیا نام دیا جائے۔ اس کا فیصلہ آپ کو خود کرنا چاہیئے۔ میں تو انہیں یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ سیاسی مفادات کے لئے عوام میں کش مکش پیدا کرنے والے ملک و قوم کے دوست اور وفادار نہیں ہوا کرتے۔ ممتاز صاحب نے بڑی چالاکی سے کراچی کے لوگوں کو اپنا بھائی قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ۔

"کراچی والے ہمارے بھائی ہیں۔ ہم نے ان کی پرورش کی ہے۔ وہ آئے تو جھونپڑیوں میں تھے اور اب فلک بوس عمارتوں میں رہتے ہیں"

مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کب ہوا۔ کیونکہ کراچی میں آج بھی ۱۵ لاکھ افراد جھونپڑیوں میں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ ۶ سال کے عرصہ میں پیپلز پارٹی نے کسی ایک جھونپڑی میں رہنے والے مہاجر کو فلک بوس عمارت میں منتقل

کیا ہو تو اس کا نام مجھے بھی بتا دیا جائے۔ ممتاز صاحب کو کراچی کا یہ رخ اپنے باتھ آئی لینڈ کے لگژری فلیٹ سے نظر آیا ہوگا ہاں یہ میں جانتا ہوں کہ ان کی پارٹی سے تعلق رکھنے والے اکثر وڈیرے جن کے آبائی گاؤں میں ہاری دو وقت کی روٹی کو ترستے ہیں۔ سال کے زیادہ عرصہ کراچی میں نو تعمیر یا زرخرید عظیم الشان بنگلوں میں رہائش پذیر رہتے ہیں اس مسئلہ پر مزید کچھ لکھنے سے قبل ممتاز صاحب کی ایک دھمکی کا بھی ذکر کرتا چلوں تو بہتر ہے۔ "کوٹہ سسٹم" کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا ہے۔

"شہر والو! تمہارے پاس ملازمتیں ہیں تم پرانے سندھیوں پر اس کے دروازے بند کرنا چاہتے ہو۔ اگر انہوں نے بھی کہا کہ تم سب کچھ ہمارے پاس سے لیتے ہو۔ پینے کا پانی، بجلی، گیس سبزیاں اور کپڑا، اگر ہم نے یہ سب کچھ بند کر دیا تو کیا ہوگا؟"

شام جی! شاید یہ اشتعال انگیزی ڈی۔ پی۔ آر کی کسی دفعہ کی زد میں نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ممتاز صاحب کے ارشادات ہی نہیں جب سے پیپلز پارٹی برسراقتدار آئی ہے عصبیت اور منافرت کی ایک منظم مہم چلائی جا رہی ہے۔ ہم نے ہر سطح پر اس کا معقولیت سے جواب دیا ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہ لوگ کسی معقول بات کو سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ سندھ اسمبلی کی کاروائی اور ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران اس موضوع پر میں نے جو مضامین روزنامہ اخبار جنگ کراچی کے

ادارتی صفحات پر لکھے تھے اس کی فائل اس وقت میرے سامنے ہے۔ میں سندھ کے شہریوں کے نکتہ نظر کو ایک بار پھر اپنے ان مضامین اور اسمبلی کی تقاریر کی روشنی میں دہرا رہا ہوں تاکہ ایک عام قاری خود فیصلہ کر سکے ظالم کون ہے اور مظلوم کون۔ کون ہے جو منافرت اور اشتعال انگیزی پھیلا رہا ہے اور کون ہے جو معقولیت کے سہارے ناانصافیوں کا ازالہ چاہتا ہے۔ چاہے وہ ناانصافیاں سندھ کے باشندوں کے کسی طبقہ کے ساتھ ہوئی ہوں۔ اور میں ان حقائق کو ثابت کرنے کی پوری پوری ذمہ داری لینے کو تیار ہوں۔ اور اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آخر مہاجروں کو ابھی تک مہاجر بنے رہنے پر اصرار کیوں ہے اور وہ سندھ کے معاشرے میں ضم کیوں نہ ہو سکے۔

❁ ہندوستان سے نقل وطن کر کے آنے والے لاکھوں مسلمان اب بھی تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں بے سروسامانی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں وہ ۳۰ سال سے مستقل آبادکاری کے منتظر رہے ہیں۔ لیکن حکومتیں انہیں مستقل آبادکاری کا دلاسہ دینے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکی ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں بار بار یہ احساس دلایا جاتا رہا ہے کہ وہ جہاں بھی جھونپڑی ڈال کر پڑے ہوئے ہیں۔ یہ عارضی جگہ ہے اور انھیں جب بھی انتظامیہ کی مرضی آئے بیدخل کیا جا سکتا ہے۔ اس بے یقینی اور بے سروسامانی کی کیفیت نے انھیں مہاجر بن کر ہی رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔

❁ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں اور پیشہ وارانہ تعلیم کے ادارول

میں داخلہ دیتے وقت ہندوستان سے سب کچھ قربان کر کے پاکستان کو اپنا وطن بنانے والے مسلمانوں کے نوجوان بچوں سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں بلکہ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ان کے باپ دادا کہاں رہتے تھے۔ یہی طریقہ کار ڈومیسائل جاری کرتے وقت بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی زبانی دعوائی نہیں بلکہ سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں کے داخلے کے فارموں میں یہ خانہ چھپا ہوا موجود ہے۔

❁ لیاقت میڈیکل کالج اور سندھ یونیورسٹی انجنیرنگ کالج میں فرسٹ کلاس حاصل کرنے والے وہ طلباء داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں جن کا تعلق ہندوستان سے آنے والے مسلم خاندانوں سے ہے اس کے برعکس ان ہندو طلباء کو داخلے مل جاتے ہیں جو اصطلاحاً SON OF THE SOIL کہلاتے ہیں

❁ ۳۰ سال کے باوجود بھارت سے آنے والے مسلمانوں کے دعادی اور کلیمز کا حتمی فیصلہ اب تک نہیں کیا گیا ہے اور کم وبیش ۲۰ ہزار کیس باقی ہیں لیکن اس کے باوجود سابق صدر یحیٰی خاں نے سٹلمنٹ کے محکمہ کو اچانک اور پراسرار طور پر صوبائی حکومتوں کے حوالہ کر دیا تھا جب کہ یہ محکمہ نہ صرف خود کفیل تھا بلکہ مرکز کی آمدنی کا ذریعہ بھی تھا اس کے علاوہ اس سے یہ بھی فائدہ تھا کہ سندھ کے مسلمان دیگر صوبوں کی متروکہ املاک میں بھی اپنا حق حاصل کر سکتے تھے جسے صوبہ تک محدود کر کے نئے اور پرانے باشندوں میں ایک اور تصادم کا راستہ کھول دیا گیا تھا۔ اب تو موجودہ حکومت نے اس محکمہ کو ہی ختم کر دیا ہے۔

یہ محض چند باتیں میں نے تمثیلاً عرض کی ہیں اور اس سے محض یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ہندوستان سے نقل وطن کرنے والوں کو مہاجر ہونے کا احساس حکومت ہی کا مسلط کردہ ہے اور یہ زخم جب بھی بھرنے لگتا ہے تو حکومت کی پالیسی اسے پھر ہرا کر دیتی ہے۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اب حکومت ہمیں مہاجر سمجھنا چھوڑ دے۔ ہم اول آخر پاکستانی ہیں۔ سندھ میں رہتے ہیں تو ثانوی اعتبار سے سندھی بھی ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایک طرف تو کوٹہ سسٹم" مسلسل اس تفریق کا احساس پیدا کرنے کا سبب بنا ہوا ہے اور دوسری طرف اوپر بیان کئے ہوئے چند اسباب مہاجروں کو معاشرہ کا جزو لاتیفک بنانے کی راہ میں حائل رہے ہیں۔ مہاجر تو خود اس معاشرے میں خود کو ضم کر دینا چاہتے ہیں۔ جنہوں نے اس وطن عزیز کے لئے قدیم گھر بار چھوڑ دیئے۔ اعزا و اقربا کو قربان کرایا۔ آگ وخون کے سمندر سے گزرنا پڑا۔ آبا و اجداد کی قبروں کو بھلایا۔ اپنے پیچھے اس زمین کو چھوڑ آئے جس کے چپہ چپہ پر مسلمان کی عظمت کے نشان ہیں۔ وہ اس روایتی اصطلاح یعنی مہاجر کو کیوں کر اپنانے پر بضد ہو سکتے ہیں۔ وہ نئے اور پرانے سندھی کی تفریق کو کس طرح پسند کر سکتے ہیں وہ تو اس کے برخلاف اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ جس پاک وطن کے لئے انہوں نے عظیم قربانیاں دیں اس وطن میں پوری طرح پیوست ہو جائیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ سب کچھ اس وقت ہو سکتا ہے جب ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے۔ جن کے باعث انہیں

معاشرہ کا جزو لاینفک بننے میں اب تک کامیابی نہیں ہو سکی۔ ان تمام امتیازات کو ڈھا دیا جائے جو نئے اور پرانے باشندوں میں تفریق کا احساس قائم رکھنے کے لئے دیوار کی طرح حائل کر رکھے ہیں اور اگر یہ ہو جاتا ہے تو پھر دنیا دیکھ لے گی کہ سندھ کے عوام مل جل کر سندھ کو پاکستان کا سب سے زیادہ خوشحال حصہ بہت مختصر عرصہ میں بنا دیں گے۔

ملازمتوں میں کراچی کے کوٹہ کا مسئلہ جیسے ممتاز بھٹو صاحب ضروری دے رہے ہے دراصل صریح ناانصافی کو برقرار رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ اول تو کوٹہ سسٹم سے خود ھی امتیاز کی بو آتی ہے اور صوبہ کے مختلف طبقوں میں کوٹہ سسٹم کے باعث اپنے علیحدہ وجود کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کراچی کے معاملے میں کوٹہ سسٹم کی تلوار دو دھاری ہے ایک طرف تو اسے سندھ میں شامل کر دیا گیا لیکن دوسری طرف مرکزی ملازمتوں میں کراچی کا حصہ علیحدہ سے مقرر کر کے کراچی اور سندھ کی علیحدہ علیحدہ حیثیتوں کو قائم رکھنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی غور طلب امر ہے کہ ماضی میں جب کراچی کا کوٹہ مرکزی ملازمتوں میں ۲ فیصد مقرر کیا گیا تھا تو کراچی کی آبادی ۱۵ لاکھ تھی اب کراچی کی آبادی ۴۵ اور پچاس لاکھ کے لگ بھگ ہے لیکن یحیٰی حکومت نے اس کوٹہ میں اضافہ کے مطالبہ پر اسے اچانک دو فیصد سے بھی کم کر کے محض ۲ کر دیا اور اب یہ ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ کراچی جو آبادی اور تعلیمی استحقاق کے اعتبار سے کم از کم چھ فیصد کا حقدار ہے اس ناانصافی کے خلاف مسلسل صدائے احتجاج بلند کرتا

رہا ہے۔
اسی طرح صوبائی ملازمتوں میں کراچی، حیدرآباد اور سکھر کا کوٹہ ۴۰ فیصد مقرر کیا گیا ہے یہ اقدام پچھلی حکومت نے بھی کیا تھا اور اس پر بھی مسلسل احتجاجات کے ساتھ ضروری گوشواروں اور اعداد شمار کے ساتھ اس غیر منصفانہ تقسیم کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور اس ضمن میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ صوبائی ملازمتوں میں کوٹہ سسٹم بالکل ختم کر دیا جائے البتہ دیہی اور پسماندہ علاقوں کیلئے ۱۰ فیصد نشستیں محفوظ کر دی جائیں اس طرح دیہی اور پسماندہ علاقوں کے طلبا کا استحقاق دو طرفہ ہو جائے گا وہ صلاحیت یا میرٹ کی بنیاد پر بھی ملازمتوں میں آسکیں گے اور اپنی مخصوص نشستوں کو بھی حاصل کر سکیں گے۔ اسی طرح دیہی اور پسماندہ علاقوں کے عوام بھی مطمئن ہو جائیں گے اور طبقاتی تفریق و امتیاز کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کوٹہ سسٹم سے دیہی علاقوں کے غریب عوام کو کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ اس سے بڑے بڑے وڈیروں کے ان لڑکوں کو فائدہ پہنچتا ہے جو شہروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور دیہی کوٹہ غصب کر لیتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں نشستوں کے تحفظ کے بعد یہ شرط بھی لگانا ہوگی کہ طالب علم نے میٹرک تحفظات کے تحت آنے والے علاقہ سے کیا ہے۔ ورنہ سندھ کے دیہی غریبوں کے استحصال کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

نفرت اور عصبیت کو جنم دینے میں لسانی تنازعہ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور ممتاز بھٹو صاحب ہی کے دور میں وہ متنازعہ لسانی بل پیش ہوا جس نے صوبہ کی سماجی

زندگی میں تصادم کی کیفیت پیدا کر دی۔

لسانی تنازعہ کی نزاکت کے بارے میں ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران میں نے ایک درجن سے زیادہ مضامین لکھے ہیں اور بار بار یہ کہا کہ اگر اس ضمن میں "تدبر اور فہم کا مظاہرہ نہ کیا گیا تو صوبہ کی سماجی زندگی میں ہل چل پیدا ہو جائے گی۔ اپریل ۷۲ء میں اس مسئلہ کے معاشی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے میں نے واضح کر دیا تھا کہ بے روزگاری میں مسلسل اضافہ کے سبب لوگ اس مسئلہ پر جذباتی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے خدارا پہلے بے روزگاری دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ بار بار میں اس بات پر زور دیتا رہا ہوں کہ صوبہ کے دو طبقوں میں نفرت اور عداوت کی تحریک کامیاب ہو گئی تو اس کے نتائج دونوں کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ صوبائی اسمبلی کے پہلے بجٹ اجلاس منعقدہ جون ۷۲ء میں بجٹ پر بحث کے دوران میں نے اپنی تقریر کا آغاز یہ کہکر کیا تھا کہ۔

" بجٹ میں ہم کتنے ہی بڑے بڑے ترقیاتی پروگرام کیوں نہ بنالیں ان کو پایۂ تکمیل تک صرف اسی صورت میں پہنچا سکتے ہیں جب کہ صوبہ کے عوام میں مکمل اتحاد یکجہتی ہو اور صوبہ کا ہر فرد اس علاقہ کی ترقی۔ فلاح و بہبود اور خوشحالی کے لئے ایک ٹیم کی حیثیت سے کام لے مجھے اندیشہ ہے کہ زبان کے نازک مسئلہ کی بنیاد پر عوام کے اس اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ زبان کا معاملہ کوئی ایسا معاملہ نہیں

کہ اسے انتشار کی بنیاد بنایا جائے۔ سندھ کے عوام سندھی اور اردو دونوں سے پیار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ زبانیں پیار محبت بڑھانے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ نفرت وعداوت کا ذریعہ نہیں اور نفرت وعداوت سے زبانوں کو کبھی ترقی نہیں دی جا سکتی۔ سندھی کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اردو داں طبقہ زیادہ سے زیادہ اسے سیکھے اور اس کی ترویج واشاعت میں حصہ لے تو اس کے لئے نفرت کی نہیں محبت کی فضاء پیدا کرنا ضروری ہے۔ سندھی یا اردو کی مخالفت کا سرے سے کوئی جواز نہیں ہے اس لئے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے، تحریک پاکستان کی اساس ہے، پاکستان کی اجتماعی تہذیب وثقافت کی عکاس ہے۔ اسی طرح سندھی ایک قدیم زبان ہے۔ سندھ کے عوام کے ایک بڑے طبقے کی زبان ہے اور اس کے قدیم تاریخی ورثہ کی امین ہے۔"

بجٹ پر مباحثہ کے دوران اور بعدازاں لسانی بل پر بحث کرتے ہوئے میں نے ہی نہیں بلکہ اسمبلی کے تمام اردو بولنے والے ممبران نے یہی موقف اور نقطۂ نظر اختیار کیا اور اس موقف کو اگر سندھی زبان یا سندھ کے قدیم باشندوں کے خلاف سمجھا جائے تو یہ ان کے ساتھ زیادتی اور تاریخی ستم ظریفی ہوگی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اسمبلی میں حزب اقتدار کے ممبران یہی کہتے رہے اور آج بھی یہی کہے جا رہے

ہیں کہ ہم نے سندھی زبان یا سندھی عوام کی مخالفت کی حالانکہ قومی اسمبلی کے موجودہ اسپیکر مسٹر معراج خالد نے جو اس وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ایک ٹی۔وی انٹرویو میں لسانی تنازعہ کے فوراً بعد خود یہ اعتراف کیا تھا کہ

"اردو بولنے والوں کے نمائندے سندھی زبان کے خلاف ہرگز نہیں تھے وہ بھی سندھی زبان کی ترقی چاہتے ہیں۔ لیکن وہ صرف اردو زبان اور اس کے بولنے والوں کا تحفظ بھی چاہتے ہیں۔"

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہمارا مقصد صوبہ میں سماجی وحدت کو برقرار رکھنا اور صوبے کے تمام طبقوں میں محبت اور اخوت کی فضاء پیدا کرنا تھا۔ یہ اگر جرم اور سازش ہے تو ہم اس کے برملا مجرم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں جتنے اندیشوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ وہ سامنے آگئے اور زبان کی بنیاد پر سندھ کے نئے اور پرانے باشندوں میں نفرت، عداوت اور تصادم کی فضا پیدا کرنے میں مخصوص عناصر کامیاب ہو گئے اور اس وقت سے سندھ میں جو صورت حال پیدا ہوئی وہ سب کے سامنے ہے۔ بہر طور اس ضمن میں یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ سندھ کے باشندوں کے ساتھ ساتھ قدیم باشندوں کے بھی ایک بڑے طبقہ نے صورتحال کو کسی حد تک سنبھالا ہوا ہے اور اسے سنگین نہیں ہونے دیا ہے۔ سماجی وحدت کے رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے مقدور بھر جد وجہد کی اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ پیر صاحب پگاڑا کا کردار قابل ذکر ہے۔ لسانی ہنگاموں

کے دوران بھی ان کے زیر اثر علاقوں سانگھڑ، شہداد پور، ٹنڈو آدم میرپور خاص اور خیرپور وغیرہ میں تصادم کا کوئی معمولی سا بھی واقعہ نہیں ہوا۔

اس صورتحال کے دو منطقی اسباب پیش کئے جا سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سندھ میں غریب ہاریوں کی حالت زار کسی سے پوشیدہ نہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں ان ہاریوں کو اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا۔ دوسری طرف کراچی اور دوسرے شہروں میں مزدور بھی اپنے حقوق کے لئے صف آرا ہو گئے۔ یوں دیہی اور شہری علاقوں میں ہاری اور مزدور کی مشترکہ جدوجہد ظلم کے خلاف مظلوموں کی جدوجہد بن گئی۔ جس کو سبوتاژ کرنے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں نظر آیا کہ سندھ کے دونوں مظلوم طبقات آپس میں لڑ پڑیں اور متحد نہ ہو سکیں تاکہ ہاری اور مزدور کا استحصال جاری رہے دیہی علاقوں میں وڈیرے اور بڑے بڑے زمیندار اور شہروں میں بڑے بڑے سرمایہ دار اپنا الو بدستور سیدھا کرتے رہیں۔

دوسرا وزنی سبب جس کا میں پہلے مسلسل ذکر کرتا رہا ہوں سندھ کے اجارہ دار ہندو ٹھاکروں کی سرگرمیاں ہیں۔ تھرپارکر کے ایک بڑے حصّہ پر بھارتی فوجوں کے قبضے کے بعد جو لاکھوں افراد بے گھر ہوئے تھے۔ ان کی خستہ حالت اور مظلومی کا جائزہ لینے کا موقع مجھے بھی ملا ہے اور بحیثیت صحافی کے مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ پورے ملک میں سب سے پہلے اخبار جنگ کراچی کے ادارتی صفحات کے ذریعے میں نے قلم اٹھایا اور عوامی نمائندے کی حیثیت سے ان مظلوموں کی حالت زار کے

بارے میں آواز بلند کی۔ میں جب ان مظلوموں کے کیمپوں میں پہونچا تو ان کی حالت زار خود ایک منہ بولتی داستان تھی۔ ساتھ ہی ان مظلوموں کی زبانوں پر دل ہلا دینے والی بھارتی فوجوں کے ساتھ ساتھ پاکستان میں آباد بعض ہندو ٹھاکروں کے ظلم و ستم کی داستانیں تھیں۔ ظلم و ستم کی یہ المناک داستان میں تفصیل سے ان دنوں اخبار جنگ کے قارئین کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ لیکن یاددہانی کے لئے صرف اتنا عرض ہے کہ ظلم کی شدت کا اندازہ محض اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جس میں تین بھائیوں کو ایک ساتھ زندہ جلا دیا گیا۔ تھرپارکر کے یہ قدیم سندھی مسلمان جب سندھ کے اندرونی علاقوں میں پھیلے اور یہ داستانیں عام ہوئیں تو سندھ کے عوام میں بھارت اجارہ دار ہندو ٹھاکروں اور ان کے پشت پناہ وڈیروں سے نفرت پھیلنا شروع ہوئی جس کے باعث یہ ٹھاکر اکھنڈ بھارت و نیز آزاد سندھو دیش کے حامی پریشانی میں مبتلا ہو گئے اور انہیں انتقامی خطرہ بہت قریب محسوس ہونے لگا تو انہوں نے ایک خطرناک سازش کی اور وہ یہ تھی کہ نفرت کا رخ ٹھاکروں اور بھارت کے ایجنٹوں سے پھیر کر نئے سندھیوں کی طرف کر دیا جائے۔ لسانی تنازعہ نے ان کے ہاتھ میں ایک بڑا ہتھیار دے دیا اور وہ کچھ ہو گیا کہ جس کے اثرات سے ہمیں آج تک نجات نہ مل سکی۔

شام صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ سندھ کے تمام طبقوں میں محبت اور یکجہتی پیدا کرنے کی جو کوششیں حزب اختلاف نے

کی ہیں اور انھیں جتنی مدد موجودہ تحریک سے ملی ہے ان کی قدر نہ کی جائے تو یہ ناسپاس گزاری ہوگی۔ میں نے ۳۰ر اگست ۷۲ء کو صوبہ میں سماجی وحدت کے رشتہ کو مضبوط کرنے کے لئے ۸ تجاویز پیش کی تھیں۔ جن پر ہماری طرف سے حتی المقدور عمل کیا گیا مگر حکومت نے انہیں قابل اعتنا نہ سمجھا آپ خود اندازہ لگائیں کہ ان تجاویز سے عصبیت کی بو آتی ہے یا محبت کی۔ یہ تجاویز جنگ کے ۳۰ر اگست ۷۲ء کے شمارے میں "قوم کے احساس محرومی کو دور کیا جائے" کے عنوان کے تحت شائع ہوئی تھیں۔

(۱) زبان کے جھگڑے کو اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے اور متنازعہ لسانی بل کو اب زیر بحث نہ لایا جائے۔ حکومت لسانی سمجھوتے پر اس کے الفاظ اور روح کے مطابق عمل کرنے اور اس قسم کے بیانات دے کر سمجھوتہ کی دھجیاں نہ بکھیری جائیں کہ "اس ضمن میں کوئی سمجھوتہ ہوا ہی نہ تھا" سمجھوتہ پر جس قدر جلد عمل درآمد ہوگا۔ اسی قدر لوگوں کے لئے زبان کا تنازعہ جو خواہ مخواہ کا پیدا کردہ ہے، لوگوں کے لئے بھلانا آسان ہوگا۔

(۲) صوبہ میں علاقائیت کے بجائے متحدہ قومیت کا پرچار کیا جائے جس کی بنیاد پر یہ ملک قائم کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں نظریہ پاکستان اور اسلام پر یقین رکھنے والے نئے اور پرانے سندھی باشندے مشترکہ طور پر جدوجہد کریں مسلم قومیت کا پرچار ہوگا تو اسلام کا جذبہ رواداری عام ہوگا اور صوبہ میں بھی عوام کے مختلف طبقوں میں یکجہتی پیدا

کرنے میں مدد ملے گی۔

(۳) سندھ کے نئے اور پرانے باشندے مشترکہ طور پر علاقائی تمدن اور ثقافت اور زبان کے تحفظ کے لئے ضلعی اور صوبائی سطح پر کونسلیں قائم کریں تاکہ نئے سندھیوں میں علاقائی زبان اور تمدن سے اجنبیت کا احساس دور ہو سکے اور دونوں طبقے سماجی، معاشرتی اور ثقافتی وحدت میں منسلک ہو سکیں یہ کونسلیں سندھی ادب کو اردو میں اور اردو ادب کو سندھی میں منتقل کرنے کے انتظامات بھی کریں اور ان کے زیر اہتمام مشترکہ اجتماعات منعقد کئے جائیں۔

(۴) سندھ کے بے زمین ہاریوں کو اراضی فراہم کرنے کے انتظامات کئے جائیں اور شہروں میں بے روزگاری دور کی جائے اس لئے کہ یہ بات واضح ہے کہ منجملہ دیگر وجوہات کے لسانی تنازعہ کا ایک بنیادی سبب اقتصادی مسائل ہیں۔ صوبہ کے تمام طبقوں میں اقتصادی محرومی کے جذبات نے ہی منافرت کو جنم دیا ہے اور اس لئے صوبے کے اقتصادی مسائل کو حل کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جانا چاہئیں۔

(۵) سندھی اخبارات رواداری کے جذبہ سے کام لیں۔ اس لئے کہ بعض سندھی اخبارات نے نئے سندھی رہنماؤں کو جس طرح سندھ کا دشمن ثابت کرنے کی تحریک چلا رکھی ہے وہ دونوں طبقوں میں خلیج وسیع کرنے کا سبب بن گئی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ سندھی اخبارات نئے سندھی رہنماؤں کے بارے میں اور اردو اخبارات قدیم سندھی رہنماؤں کے بارے میں حقیقت پسندانہ موقف اختیار کریں اور اگر

وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تو کم از کم ان مسائل میں حاشیہ آرائی سے گریز کریں یا پھر خاموش رہیں۔

(۶) سیاسی رہنما علاقائی کے بجائے قومی نقطۂ نظر اختیار کریں اور قومی مسائل کو اوّلیت دیں۔

(۷) ایک طرف سے اگر نفرت کا مظاہرہ کیا جائے تو اس کا جواب نفرت سے دینے سے گریز کیا جائے بلکہ اخوت اور محبت کا پرچار جاری رکھا جائے۔

(۸) ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں امتیازات کا خاتمہ کیا جائے اور سندھ کے تمام باشندوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔

شام صاحب! ہم تو اس صوبے میں اتحاد اور اس کی ترقی کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں۔ سندھ اسمبلی میں ۷ رجولائی ۱۹۷۲ء کو جب لسانی بل پیش کیا گیا۔ اس موقع پر ہماری اور پیپلز پارٹی کے اراکین کی تقریروں سے یہ فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ منفی یا مثبت کردار کس کا تھا۔

گفتگو چونکہ طویل ہو گئی ہے ورنہ ممبران اسمبلی کی تقاریر کے اقتباسات بھی پیش کر دیتا جو اسمبلی کی روئداد میں سرکاری طور پر طبع ہو کر محفوظ ہیں۔ بہرطور میری اس عرضداشت کا سارا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اپنے خلوص کا یقین بار بار دلا کر تھک چکے ہیں۔ مگر جو لوگ اپنی سیاست کا منشا ہی اشتعال انگیزی اور دروغ بیانی کو بنا لیں تو ان کی حیثیت ہمارے نزدیک ایک لاعلاج مریض کی ہے۔ اور انشاء اللہ وہ وقت قریب ہے

جب سندھ کے نئے اور پرانے باشندے مل کر ان لاعلاج مریضوں کی بیمار قیادت کو مسترد کر دیں گے۔ یہ ۶ سال ہماری تاریخ کا سیاہ باب ہیں اور تعصب کی جس آگ کو اس دوران اِن لوگوں نے بھڑکانے کی مسلسل کوشش کی ہے وہ آگ خود ان کو ہی جلا دے گی کیونکہ موجودہ تحریک نے ہر محب وطن کو اس کا احساس دلایا ہے کہ ؎

رہِ وطن میں شہیدوں نے کیوں دیا تھا لہو
اس لئے کہ تعصب یہاں جنم پائے؟
چراغ خون سے کیا اس لئے جلائے تھے
سجے سجائے ہوئے گھر میں آگ لگ جائے؟

گفتگو طویل ہو گئی ہے۔ اس لئے اب اجازت دیں۔

نوازش

خادم
ظہور الحسن بھوپالی

جناح اسپتال کراچی

حرفِ آخر

میں نہیں کہہ سکتا گذشتہ صفحات کو پڑھ کر قارئین نے اس کتاب کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی مگر جہاں تک میرا تعلق ہے کتاب کی ترتیب و تدوین کے بعد میں نے جب اس کا مطالعہ کیا تو مجھے جگہ جگہ تشنگی کا احساس ہوا مگر اس تشنگی کا ازالہ میرے لئے ممکن نہ تھا۔ مجھے ۱۷؍جون ۷۷ء بروز جمعتہ المبارک تقریباً ۵½ بجے اسپتال ہی میں پروانۂ رہائی ملا۔ اسیری کے یہ چوراسی دن ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک مختصر سا خواب ہے سرکار کی جانب سے میری اسیری ختم کردی گئی ہے مگر ابھی تک ہسپتال ہی میں ہونے کے ناطے میں اس کے احساس سے نجات حاصل نہیں کرسکا ہوں کئی بار یہ سوچا کہ اس کتاب میں جو کمی مجھے محسوس ہوتی ہے اسے دور کرنے کی کوشش کروں مگر لوگوں کی محبتوں اور دوستوں کی آمدورفت میں ایک طرف تو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا اور دوسری طرف یہ خیال بھی آیا کہ اب اس کتاب میں اضافے سے کہیں مصنوعیت پیدا نہ ہوجائے پھر سوچتا ہوں کہ اسیری کے چند دن اور ملتے یا یارانِ سیاست فرصت دیتے تو اس کتاب میں چند خطوط کا اضافہ اور کرتا ایک خط شیخ طریقت مولانا حامد علیخاں صاحب کو لکھتا جنھوں نے حالیہ تحریک میں مجھ جیسے نہ جانے کتنے اسیروں کی ہمتوں کو سربلند رکھنے میں اپنی ضعیفی اور بیماری کے باوجود بھرپور کردار ادا کیا۔ سوچتا ہوں کہ ایک خط مجھے علامہ عبدالمصطفٰے الازہری کو بھی لکھنا چاہئیے تھا جن کا میری ابتدائی سیاسی زندگی پر اس قدر گہرا اثر ہے کہ میں انھیں کسی بھی لمحے فراموش نہیں کر پاتا۔ یہ احساس بھی ہے کہ ایک مکتوب حیدرآباد

کے جیالے شہریوں کو قلب کی گہرائیوں کے ساتھ نذرانہ تحسین پیش کرتا + اس کوتاہی کا بھی احساس ہے کہ میرا قلم میرے محترم بزرگ صوفی ایاز خان نیازی کو خراج تحسین نہ پیش کر سکا جنھوں نے پیرانہ سالی میں کراچی میں اس مرحلے پر قومی اتحاد کو پرعزم قیادت دی جب کہ ہر سطح کے قائدین کی بڑی تعداد اسیر ہو چکی تھی۔ بہر طور مجھے احساس ہے کہ میں اپنے قلم کو وہ جولانی نہ بخش سکا جس کے ذریعہ میں اس ملک کے چپہ چپہ کے شہیدان باصفا اور اسیران باوقا کو بھرپور خراج عقیدت پیش کر سکتا۔

میں نے اپنے ان خطوط میں حالیہ تحریک کے بارے میں بھی محض سرسری سا جائزہ پیش کیا ورنہ میری رہائی کے بعد مجھے ملک کے مختلف حصوں کے بارے میں جو مصدقہ اطلاعات ملیں جب بھی ان کا تفصیلی خاکہ تحریری شکل میں پیش کیا جائے گا تو اس کا ہر لفظ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہوگا۔ برادرم محمد حنیف حاجی طیب یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے محمد یعقوب قادری ایڈوکیٹ اور اپنے بے شمار ساتھیوں کے ذریعہ جس عرق ریزی کے ساتھ ملک کے کونے کونے سے مصدقہ واقعات جمع کئے ہیں۔ وہ قرون اولیٰ کی ایک ایسی داستان نظر آتے ہیں جنہیں سنکر جہاں بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں وہاں جذبۂ ایمانی کو تقویت بھی پہنچتی ہے۔ انھوں نے پنجاب کے ممتاز عالم دین مفتی مختار احمد صاحب (سیالکوٹ) کے زخمی ہونے کا جو واقعہ مجھے سنایا وہ اس ملک کے مسلمانوں کے دین اور علماء دین سے محبت کی دلیل ہے مفتی صاحب جلوس کی قیادت کر رہے تھے ان کو نشانہ بنا کر گولیاں چلائی گئیں مگر غلامان نبی ان کی آڑ بن گئے چھ افراد نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور خود مفتی صاحب کو بھی چھ گولیاں لگیں مگر کسی مرحلے پر ان کے عزم و حوصلہ میں کمی نہ آئی اسی طرح

ملتان میں مولانا حامد علی خاں صاحب کی گرفتاری پر پیش آنے والے واقعات اور حیدرآباد میں جیالے شہریوں کی جرأت کے واقعات محض داستانیں ہی نہیں تاریخ کا ایک عظیم حصہ بن چکے ہیں۔ محمد حنیف طیّب نے اب تک اڑسٹھ شہروں اور قصبوں سے تفصیلی رپورٹیں جمع کی ہیں اور انھیں مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔ ان تفصیلات کو مدّون کر کے شائع ہونا چاہیئے تاکہ تاریخ میں محفوظ ہو جائیں۔

خواہشات اور آرزوں کے ہجوم میں اس قدر الجھ گیا ہوں کہ کسی فیصلہ پر پہنچنے میں کامیابی نہ ہو سکی اور اسی لئے میں نے یہ بہتر سمجھا کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے قارئین سے اجازت حاصل کر لی جائے تاکہ جو کچھ ہے اسے جلد از جلد پیش قارئین کیا جا سکے۔ اب رہی بات تشنگی کی تو یار زندہ صحبت باقی ویسے بھی انسان اپنی سوچوں کے دھارے کا ساتھ نہیں دے سکتا اور مستقبل کے پروگراموں کا حتمی یقین اسکے لئے ممکن نہیں۔ گرفتاری کے بعد میرے ذہن میں لکھنے لکھانے کا جو تصور تھا اب دیکھ لیجئے۔ وہ بھی پورا نہ ہو سکا کیونکہ میں نے یہ سوچا تھا کہ فرصت کے لمحات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے گزشتہ سال کے دورۂ برطانیہ کی یادداشتیں قلمبند کروں۔ پھر خود ہی اس خیال کو یہ سوچ کر مسترد کر دیا کہ میرا سفر بھلا کس کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکے گا کیونکہ اس میں نہ تو ہالی ووڈ کے تذکرے ہونگے اور نہ ہی پیکاڈلی سرکس پر واقع نائٹ کلبوں میں رقص کرنے والی رقاصاؤں کے برہنہ حسن کا نظارہ، نہ تو میں "پب" کا نقشہ کھینچ سکوں گا اور نہ ہی مجھے ہر قدم پر ملنے والی لڑکی مسکراہٹیں بکھیرتی نظر آئے گی۔ ایسی صورت میں لوگ یا تو مجھے احمق تصور کریں گے یا جھوٹا گردانیں گے اس لئے اس سے فرار ہی مناسب سمجھا۔ پھر خیال آیا کہ دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے نظاروں کو قلمبند کروں۔ مگر میں نے اپنی تحریر، اور الفاظ کو اس مقدس سفر کی داستان

میں عاجز پایا۔

اس کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک کے سیاسی اتار چڑھاؤ اور حالات حاضرہ کے بارے میں ۱۹۷۱، ۱۹۷۲ اور ۱۹۷۳ء کے دوران روزنامہ جنگ کے ادارتی صفحات پر میرے جو مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان کا مجموعہ تیار کیا جائے، تاکہ سقوط مشرقی پاکستان کے پس منظر اور پیش منظر، یحییٰ اور مجیب سے ملاقاتوں، ۷۰ء کے انتخابات کے بعد کے سیاسی اتار چڑھاؤ کے بارے میں ایک دستاویز تیار ہو سکے اس ضمن میں خاصا کام میں نے مکمل بھی کر لیا ہے اور میرا ارادہ یہی تھا کہ یہ مجموعہ اضافہ اور ترتیب کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔ مگر والد محترم نے خطوط کی اشاعت کی تجویز پیش کر دی۔ دوستوں کی بھی یہی رائے ہوئی اور یوں آپ نے جو کتاب پڑھی وہ آپ کے ہاتھوں تک پہنچ گئی۔ موقع ملا اور حالات نے اجازت دی تو مضامین کا مرتبہ مجموعہ بھی آپ تک پہونچانے کی کوشش کرونگا اور امید ہے کہ اسے پڑھ کر آپ بڑی قریب سے ہمارے موجودہ سیاسی المیہ کے پس منظر میں جھانک سکیں گے۔

ان خطوط میں اسپتال کی جن محفلوں کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اس میں بہت سے لوگوں کا ذکر دانستہ یا نادانستہ نہیں کر سکا۔ کچھ کا ذکر تو اس لئے نہیں کیا کہ میں نے انہیں پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہا، اور بعض افراد کا ذکر نہ کر کے مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے، برادرم جاوید جو جناب بوستان علی ہوتی کے توسط سے مجھے ملے اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے بہت قریب آگئے، ان میں سے ایک ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ میرے قارئین، میری تحریروں کو پسند کریں یا نہ کریں، انہیں ان تک پہنچانے کی جرأت ——— کو داد ضرور دیں گے میں ابھی ہسپتال ہی میں ہوں۔ تکلیف میں کوئی خاص کمی نہیں آئی ہے

ڈاکٹر سلمان احمد خان کا اصرار ہے کہ ہانگ کانگ چلا جائے جہاں "ہڈیوں کا جدید ترین" اسپتال ہے۔ ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ اور جاؤں تو کب جاؤں۔ ابھی یا اکتوبر کے بعد، پھر یہ خیال بھی ہے کہ علاج کے لئے تو میں لندن بھی گیا تھا۔ مگر وہاں "چیک اپ" سے زیادہ کی ہمت نہ کر سکا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو۔ اپنے دوستوں، بزرگوں اور ہمدردوں کو اتنا یقین دلا دینا چاہتا ہوں کہ بیماری نہ پہلے میرا حوصلہ پست کر سکی اور نہ انشاءاللہ کبھی کر سکے گی، اسی طرح جب بھی انتھک جدوجہد کی شدید ضرورت پڑ گئی ہے تو یہ ہماری اس جدوجہد میں کبھی حائل نہ ہو سکی اور نہ انشاءاللہ اب ہو گی۔ معرکہ کا وقت آئے گا تو مجھے اسی طرح مصروف عمل پائیں گے جس طرح کہ انہوں نے مجھے ایک بڑے آپریشن کے باوجود جنوری سے مارچ تک پایا تھا۔

دعا کریں کہ میں ان الفاظ کی سچائی کو ثابت کر سکوں۔

خدا حافظ

۷۸۶

مکتبہ قدسیہ

کے زیر اہتمام

دوسری معرکۃ الآراء کتاب

بیگمات بھوپال

حالیہ تحریک کے دوران خواتین کے جرأتمندانہ کردار سے متاثر ہو کر اُن اولوالعزم فرمانروا خواتین کی داستان پیش کی جا رہی ہے جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

بہ

مولانا وہاج الدین چشتی

کی اثرانگیز تحریر طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر جلد ہی آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔